تفسیرِ سورۃ الحمد

العرفان

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید روح اللہ موسوی خمینی رضوان اللہ علیہ

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

تفسیرِ سورۃ الحمد

العرفان

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید روح اللہ موسوی خمینی رضوان اللہ علیہ

Al-Mehdi Islamic Centre
G-9/2
Islamabad
051-2852066

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

کتاب .... قرآن در صحنہ

.... (تفسیر سورۂ الحمد)

ترجمہ .... مستجاب احمد انصاری

تصحیح و تحقیق .... رضا حسین رضوانی

کمپوزنگ .... عبدالرزاق جعفرانی

طبع ششم .... اکتوبر ۲۰۰۸ء

مطبع .... محراب پریس کراچی

جملہ حقوق محفوظ ہیں: یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ جامعہ ہذا کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل میں تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریۃً کرائے پر دی جائے گی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کی جائے گی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنے والے پر یہ شرط عائد نہ کرنے کے لئے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی۔

فہرست

[redacted]

تمہید

تفسیر کے معنی ہیں قرآن پر سے پردہ اٹھانا ۱۳

پہلا درس

بسم اللہ کی بحث ۱۶

اللہ کے نام اس کی ذات کی علامت ہیں ۱۶

سارا عالم اللہ کا نام ہے ۱۷

کوئی ممکن خود بخود وجود میں نہیں آتا ۱۷

موجودات اللہ کی نشانی ہیں ۱۹

جو موجود محدود ہو وہ ممکن الوجود ہوتا ہے ۱۹

اسم اعظم کیا ہے ۲۰

سب موجودات تسبیح کرتی ہیں ۲۰

ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ۲۲

تمام حرکات اسمائے الٰہی ہیں ۲۲

دنیا کی تمام چیزیں اسی کا جلوہ ہیں ۲۴

اللہ، جامع جلوہ ہے ۲۵

کوئی تعریف کسی اور کی تعریف نہیں ہے ۲۶

یقین کرنا اور ہے اور علمی اعتقاد اور ہے ۲۸
اعمال و افعال ٹھوس شکل اختیار کریں گے ۲۹
مان لینے اور عقلی طور پر سمجھ لینے میں فرق ہے ۳۰
انسان پر سب مصیبتیں حب نفس کی وجہ سے آتی ہیں ۳۲
سب تعریفیں اسی کی ہیں ۳۲
پائے استدلالیاں چوبیں بود ۳۳

دوسرا درس

ہر سورت کی بسم اللہ مختلف ہے ۳۵
ہر ممکن اپنے تحقق اور بقا دونوں میں محتاج ہے ۳۷
موجودات خدا کا جلوہ ہیں ۳۸
ہجرت الی اللہ ۴۲
ستر سال اس طرف ۴۳
بدترین دشمن ۴۴
لڑائی جھگڑوں کی وجہ انانیت ہے ۴۴
انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ۴۶
جہاد اکبر ۴۷
حکم الٰہی کی تعمیل میں خلوص دیکھا جاتا ہے ۴۸
ہماری عبادت جنت کے لیے ہے ۴۹
انبیاء علیہم السلام انسان بنانے کے لیے آئے ہیں ۵۰
جوانوں سے خطاب ۵۱
نفس پر مکمل فتح تک کوشش ۵۲

تیسرا درس

حق اور خلق ۵۴
حمد کے معانی ۵۶
موجودات میں تجلی ۵۷
مشاہدات انبیاء علیہم السلام ۵۸
تجلی کے معنی ۶۱
قرآن کی ماہیت ۶۲
قرآن کی تفسیر ۶۳
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی الجھن ۶۵
علم میں اجارہ داری کا رجحان ۶۶
علوم، اللہ کی یاد میں رکاوٹ بنتے ہیں ۶۷
ذہنیات اور عینیات ۶۸
خدا کے لیے قیام ۷۰
دنیا کی محبت فتنوں کی جڑ ہے ۷۱
حب نفس ۷۲
ہر عمل خدا کے لیے ہونا ۷۶
قلوب پر دعا کا اثر ۷۷
دعا اور حدیث کے بغیر قرآن ۷۸

چوتھا درس

باءِ بسم اللہ ۸۱
اسم تجلی مطلق ہے ۸۲

جلوہ، جلوے والے سے جدا نہیں ۸۴
اصل حقیقت صرف ذات مقدس اور اس کا جلوہ ہے ۸۵
اصل حقیقت جو کچھ ہے، وہی ہے ۸۵
ذات اور جلوے کی مثال دریا اور موج کی مثال ہے ۸۶
کسی بھی کمال کے فقدان کے معنی تعین ہیں ۸۷
مشاہدے کا قدم دلیل و برہان سے آگے ہے ۸۹
اہل برہان اندھے ہیں ۸۹
ایمان، ادراک قلبی کا نام ہے ۹۰
یہ کہنے سننے سے اونچی باتیں ہیں ۹۱
دل کا بھی کچھ اور ہی مسئلہ ہے ۹۱
جو کچھ ہم محسوس کرتے ہیں وہ سب اعراض ہیں ۹۲
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسم اعظم ہیں ۹۳
ہمارے وجود بھی تجلی ہیں ۹۴
تعینات جلوے کا لازمی نتیجہ ہیں ۹۵
یقین ضروری ہے ۹۶
عقیدے کی بنیاد دلیل پر ہونی چاہیے ۹۶
جو بات معلوم نہ ہو اس کا انکار کفر ہے ۹۸
مطلق انکار راستے کا پتھر ہے ۹۹
ہم جمود کو دل سے نکال دیں ۹۹
نبوت کا قطعی انکار ۱۰۰
دعائیں اور عبادتیں وسیلہ ہیں ۱۰۱
عدل حق تعالیٰ کی صفت ہے ۱۰۱

پانچواں درس

ایرانی، ترک اور عرب کے مابین انگور کا قضیہ ۱۰۲
مختلف گروہوں اور ان کی تعبیروں میں تصفیہ کی راہ ۱۰۳
علت و معلول ۱۰۵
اثر اور مؤثر ۱۰۶
ھُوَ مَعَکُمْ کا مفہوم ۱۰۶
لڑائی کیوں ہوتی ہے؟ ۱۰۹
ائمہ علیہم السلام کی دعاؤں کے کلمات ۱۱۰
امام خدا سے دعا مانگتے ہیں ۱۱۱
وہ مسئلہ جس کا تصور اس کی تصدیق سے مشکل تر ہے ۱۱۳
امام علی علیہ السلام اللہ کی آنکھ ہیں، اللہ کا نور ہیں ۱۱۴
ہر بات کی تحقیق ضروری ہے ۱۱۶
غلط فہمیاں دور ہونی چاہئیں ۱۱۷
چیونٹی بھی اپنی ذات سے محبت کرتی ہے ۱۱۸
بعض مسائل سے محروم رہنا بدقسمتی ہے ۱۱۹
لوگوں سے دعائیں چھڑانا بالکل غلط ہے ۱۲۱
کسروی اور حافظ ۱۲۲
فہرست آیات قرآنی ۱۲۴
اشاریہ ۱۲۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۱﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲﴾ الرَّحْمٰنِ
الرَّحِيْمِ ﴿۳﴾ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ
وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۵﴾ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ
الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۶﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾

امام خمینیؒ

(استاد شہید مرتضیٰ مطہری کی نظر میں)

آیت اللہ العظمیٰ آقائے خمینی مدظلہ اس خاکسار کے عظیم استاد ہیں۔
(خدمات متقابل اسلام درایران صفحہ ۲۲۴)

قم المقدسہ ہجرت کرنے کے بعد میں نے اپنا گوہر مقصود ایک اور شخصیت میں پالیا۔ میں نے سوچا کہ میری پیاسی روح اس شخصیت سے سیراب ہوجائے گی۔ اگرچہ میں اپنے قم کے قیام کے آغاز میں ابھی "مقدمات" سے فارغ نہیں ہوا تھا اور "معقولات" میں داخلے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا لیکن میری محبوب شخصیت کی جانب سے جو اخلاقی درس ہر جمعرات اور جمعہ کو دیا جاتا تھا اور جو اخلاق کے خشک مطالب پر مبنی نہیں بلکہ درحقیقت معارف اور سیرو سلوک کا درس ہوتا تھا وہ مجھے سرشار کردیتا تھا۔ بلاشبہ یہ درس مجھے اس قدر وجد میں لاتا تھا کہ آئندہ ہفتے کے منگل اور بدھ تک اس کا مجھ پر گہرا اثر رہتا تھا۔ میری شخصیت کے ایک بڑے اہم حصے کی تعمیر اس درس میں اور بعد میں دوسرے درسوں میں ہوئی جو میں نے بارہ سال کے عرصے میں اس استاد ربانی

سے حاصل کیے۔ میں نے اس بارے میں ہمیشہ اپنے آپ کو ان کا مرہون منت سمجھا ہے۔ بلاشبہ وہ ''روح قدس الٰہی'' تھے۔

(علل گرایش بہ مادیگری صفحہ ۸)

وہ ایک ایسے مسافر ہیں کہ ''اہل دل'' کے سیکڑوں قافلے ان کے ہمرکاب ہیں۔ یہ بات ان پر صادق آتی ہے:

''چلو تو سارے جہاں کو ساتھ لے کے چلو۔''

ان کا نام، ان کی باتیں، ان کی پرجوش روح، ان کا آہنی عزم، ان کی ثابت قدمی، ان کی شجاعت، ان کی روشن فکری اور ان کے ولولہ انگیز اور ایمان افروز ارشادات زبان زد خاص و عام ہیں یعنی جان جاناں، دلاوروں کے دلاور، ملت ایران کی آنکھوں کا تارا اور ہمارے عالی مرتبت استاد حضرت آیت اللہ العظمیٰ خمینی مدظلہ ایک ایسا ''احسان الٰہی'' ہیں جو خداوند کریم نے ہمارے زمانے کو عنایت فرمایا ہے۔ امام خمینیؒ إِنَّ لِلّٰهِ فِي كُلِّ خَلَفٍ عُدُولاً يَنفُونَ عَنهُ تَحرِيفَ المُبطِلِينَ [1] کا واضح اور روشن مصداق ہیں۔

اس فیض کے سبب جو میں نے بارہ سال تک ان عظیم بزرگ سے حاصل کیا ہے اور ان روحانی اور معنوی فوائد کے شکرانے کے طور پر جو اس سرچشمۂ فضیلت کی قربت کے سبب مجھے حاصل ہوئے ہیں اپنے جذبات و احساسات کی شدت کی ہلکی سی جھلک پیش کرنے کے لئے میرا قلم بیتاب ہے۔

(نہضت ہای اسلامی در صد سالہ اخیر صفحہ ۸۷)

میں نے تقریباً بارہ سال ''امام'' کی خدمت میں رہ کر تعلیم حاصل کی

۱۔ بلاشبہ ہر زمانے میں خدا کے ایسے عادل بندے ہوتے ہیں جو اس کے دین کو اہل باطل کی تحریفات سے محفوظ رکھتے ہیں۔

ہے لیکن جب میں ان کے پیرس کے حالیہ سفر کے دوران ان سے ملنے گیا تو میں نے ان میں کچھ ایسی چیزیں دیکھیں جنھوں نے نہ صرف مجھے حیرت زدہ کردیا بلکہ میرے ایمان میں بھی اضافہ کیا۔ جب میں واپس آیا تو دوستوں نے پوچھا: ''تم نے کیا دیکھا؟'' میں نے کہا: میں نے چار عدد آمَنَ دیکھے:

آمَنَ بِهَدَفِه: وہ اپنے مشن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اگر ساری دنیا بھی اکٹھی ہو جائے تو انھیں ان کے مشن سے نہیں ہٹا سکتی۔

آمَنَ بِسَبِيلِه: انھوں نے جو راستا چنا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ انھیں اس راستے سے ہٹانا ممکن نہیں ہے۔ یہ اسی طرح کا ایمان ہے جیسا کہ رسول اکرمؐ اپنے مقصد اور راستے پر رکھتے تھے۔

آمَنَ بِقَولِه: میں جتنے دوستوں کو جانتا ہوں ان میں سے ایک بھی ان کی طرح ایران کے لوگوں کی ذہانت پر یقین نہیں رکھتا۔ لوگ انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ جناب آپ ذرا آہستگی سے کام لیں، ممکن ہے لوگوں کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے، ممکن ہے لوگ ہمت ہار جائیں لیکن وہ فرماتے ہیں: نہیں! یہ لوگ ایسے نہیں ہیں جیسا تم کہتے ہو۔ میں لوگوں کو بہتر سمجھتا ہوں اور ہم دیکھتے ہیں کہ روز بروز ان کے قول کی صداقت ثابت ہوتی جارہی ہے۔ سب سے آخر میں اور سب سے بڑھ کر آمَنَ بِرَبِّه ہے۔

ایک نجی محفل میں انھوں نے مجھ سے فرمایا تھا: ''یہ ہم نہیں ہیں جو ایسا کر رہے ہیں۔ میں تائید الٰہی کو واضح طور پر محسوس کرتا ہوں۔''

جو شخص خدا کی مدد اور تائید کو محسوس کرے اور خدا کی راہ میں قدم بڑھائے تو خدا بھی إِن تَنصُرُوا اللّٰهَ يَنصُرْكُمْ کے مصداق اس کی مدد میں اضافہ فرماتا ہے۔ (پیرامون انقلاب اسلامی صفحہ ۲۱)

بلاشبہ اس رہنما کی سرفروشی، ظلم اور ظالم کے خلاف انتھک جدوجہد، مظلوم کا سرتوڑ دفاع، صداقت، صاف گوئی، شجاعت اور سودے بازی سے اجتناب نے اس کے بطور رہنما چنے جانے میں اپنا کردار ادا کیا لیکن بنیادی وجہ ایک اور چیز ہے اور وہ یہ کہ — امام خمینی کی آواز — اس ملت کی تہذیب کے قلب، تاریخ کی پہنائیوں اور روح کی گہرائیوں سے ابھری ہے۔ وہ لوگ جن کی روح میں چودہ سو سال تک محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ، سلمانؓ، ابوذرؓ اور لاکھوں دوسرے مردوں اور عورتوں کے نعرے سرایت کر گئے تھے، انھوں نے ایک مرتبہ پھر وہی جانی پہچانی آواز اس شخص کے حلق سے سنی۔ انھوں نے علیؑ اور حسینؑ کو اس کے چہرے میں دیکھا اور اسے اپنی بھولی ہوئی تہذیب کا نمائندہ قرار دیا۔ امام نے کیا کیا؟

انھوں نے ہمارے لوگوں کو تشخص عطا کیا، انھیں ان کی شناخت اور اسلامی انفرادیت لوٹا دی، انھیں کسمپرسی کی حالت سے باہر نکالا۔ یہ سب سے بڑا تحفہ تھا جو انھوں نے ملت کو دیا۔ انھوں نے لوگوں کا کھویا ہوا ''ایمان'' انھیں واپس دلایا اور ان کی خوداعتمادی بحال کردی۔

(پیرامون انقلاب اسلامی صفحہ ۱۱۹)

تمہید

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

تفسیر کے معنی ہیں قرآن پر سے پردہ اٹھانا

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں سورۂ حمد کی تفسیر کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے ہم جیسے لوگ عہدہ برآ ہوسکیں۔ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں درجۂ اول کے علماء نے جن میں اہل سنت بھی ہیں اور اہل تشیع بھی، اس موضوع پر بکثرت کتابیں لکھی ہیں لیکن ہر شخص نے اس علم کے لحاظ سے جس میں اسے مہارت تھی قرآن کریم کے صرف ایک پہلو کی تفسیر کی ہے اور معلوم نہیں کہ وہ پہلو بھی مکمل ہے یا نہیں مثلاً گزشتہ چودہ صدیوں میں عرفاء نے جو تفاسیر لکھی ہیں — جیسے محی الدین ابن عربی، عبدالرزاق کاشانی یا ملا سلطان علی — ان سب نے عارفانہ انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے بہت عمدہ تفاسیر لکھی ہیں اور جس فن میں انھیں تخصص حاصل تھا اس پر بھی خوب لکھا ہے مگر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ قرآن نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے قرآن

کے ایک حصے پر سے پردہ اٹھایا ہے یا اس کے کچھ پہلو بیان کیے ہیں۔ ایسے ہی طنطاوی جوہری اور سید قطب وغیرہ ہیں۔ انھوں نے ایک جداگانہ طرز پر تفسیر کی ہے لیکن وہ بھی ہر معنی میں قرآن کی تفسیر نہیں ہے۔ بہت سے دوسرے مفسرین ہیں جن کا تعلق ان دونوں گروہوں سے نہیں ہے جیسے شیخ طبرسی جن کی مجمع البیان بہت عمدہ اور بلند پایہ تفسیر ہے۔ یہ تفسیر اہل سنت اور اہل تشیع کے اقوال کی جامع ہے۔ بہت سی دوسری تفسیریں بھی لکھی گئی ہیں مگر ان سب کا یہی حال ہے۔ قرآن مجید کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کی ہم یا کوئی اور ایسی جامع تفسیر کرسکے جو تمام قرآنی علوم پر واقعی حاوی ہو کیونکہ کچھ ایسے علوم بھی ہیں جو ہماری سمجھ سے ماوراء ہیں۔ ہم تو کتاب اللہ کی کی صرف ایک شکل یا اس کا ایک پہلو سمجھ سکتے ہیں۔ باقی کے لیے ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی تفسیر کی ضرورت ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے اصل معلم تھے۔

کچھ دن سے ایسے لوگ بھی ہوگئے ہیں جو قطعاً تفسیر کے اہل نہیں ہیں۔ یہ لوگ اپنے مخصوص مقاصد کو قرآن وسنت سے منسوب کرنا چاہتے ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ بائیں بازو کا ایک گروہ اور کچھ کمیونسٹ بھی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ قرآن سے علاقہ رکھتے ہیں لیکن وہ اپنے خاص مقاصد کے تحت ایسا ظاہر کرتے ہیں۔ تفسیر سے کیا، ان کا تو قرآن سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ لوگ اپنی بات جوانوں کے گلے سے یہ کہہ کر اتارنا چاہتے ہیں کہ یہی اسلام ہے۔

اسی بنا پر میں عرض کروں گا کہ جن لوگوں کو کافی علمی دستگاہ نہیں ہے اور جن لوگوں کو نہ اسلامی مسائل کا ادراک ہے اور نہ اسلام سے واقفیت ہے

انھیں کوئی حق نہیں کہ وہ قرآن کی تفسیر میں دخل دیں اور اگر وہ اپنی کسی غرض کی بنا پر ایسا کرتے ہیں تو ہمارے نوجوانوں کو چاہیے کہ ان کی تفسیر کی طرف کوئی توجہ نہ کریں۔ اسلام میں تفسیر بالرائے ممنوع ہے۔ جو شخص اپنی رائے کو قرآن کے سر منڈھنا چاہتا ہے، وہ یا تو مادہ پرست ہے جو اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر اور تاویل کرتا ہے یا پھر ان لوگوں میں سے ہے جو قرآن کے کچھ روحانی معنی بیان کرتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ بھی اپنی رائے کے مطابق قرآن کی تاویل کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ہم ہر لحاظ سے ان دونوں قسم کے لوگوں سے دوری اختیار کریں۔ قرآن کے بارے میں ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ کسی کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ اس کی جو بھی رائے ہو اسے قرآن سے منسوب کردے اور کہہ دے کہ یہی قرآن ہے یا قرآن یہی کہتا ہے۔

میں جو تفسیر بیان کر رہا ہوں وہ محض احتمالی ہے۔ چنانچہ اگر میں قرآن کریم کی بعض آیات کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں تو میں یہ نہیں کہوں گا کہ ان آیات کا یہی مطلب ہے جو میں نے مراد لیا ہے یعنی میں احتمال کے طور پر بات کروں گا نہ کہ حزم ویقین کے طور پر لہٰذا میں یہ نہیں کہوں گا کہ ان آیات کا مطلب یہی ہے، کوئی اور مطلب نہیں ہے۔

چونکہ بعض حضرات نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ تفسیر سے متعلق کچھ گفتگو ہو جائے اس لیے میں نے یہ طے کیا ہے ہفتے میں ایک دن سورۃ الحمد کے متعلق کچھ مختصر سی گفتگو کروں۔ میں ایک بار پھر اس بات کو دہراتا ہوں کہ یہ تفسیر قطعی نہیں ہے اور نہ اس کا مقصد تفسیر بالرائے ہے۔ جو کچھ ہم سمجھتے ہیں وہ بطور ایک احتمال کے ہے۔

پہلا درس

اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ

بِسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

اَلحَمدُ لِلّٰهِ رَبِّ العٰلَمِینَ

بسم اللہ کی بحث

یہ ممکن ہے کہ قرآن کریم کی تمام سورتوں کے شروع میں جو بسم اللہ ہے اس کا تعلق ان آیات سے ہو جو اس کے بعد آتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس بسم اللہ کا تعلق مثلاً ایک معنی مقدر (فعل محذوف) سے ہے لیکن غالب خیال یہ ہے کہ ان بسم اللّٰہوں کا تعلق ان کے بعد آنے والی سورتوں سے ہے مثلاً سورۃ الحمد میں بِسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ کا تعلق اَلحَمدُ لِلّٰهِ سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کہ سب تعریف اسی کے لیے ہے۔ نام کیا چیز ہے؟ یہ کسی کو پہچاننے کے لیے ایک علامت ہے۔ جب انسان کسی شخص یا چیز کا کوئی نام رکھتا ہے تو وہ اس کی پہچان کے لیے علامت کے طور پر کام کرتا ہے۔ اگر کسی کا نام زید ہے تو وہ اس لیے ہے کہ لوگ سمجھ جائیں کہ زید کون ہے۔

اللہ کے نام اس کی ذات کی علامت ہیں

اللہ کے نام بھی اس کی ذات مقدس کی علامت ہیں۔ انسان جو اللہ کی ذات پاک کا کچھ ناقص علم حاصل کرسکتا ہے وہ اس کے اسمائے حسنیٰ ہی کے ذریعے سے حاصل کرسکتا ہے ورنہ اس کی ذات مقدس تک انسان کی رسائی

ممکن ہی نہیں یہاں تک کہ خود خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی وہاں تک رسائی نہیں ہے حالانکہ آپ اعلم البشر اور اشرف البشر ہیں۔ اس کی ذات کا مرتبہ سوائے اس کی ذات پاک کے کوئی نہیں پہچانتا۔ انسان صرف اسمائے الٰہی تک ہی رسائی حاصل کرسکتا ہے۔

اسمائے الٰہی کے بھی مراتب ہیں۔ بعض مراتب ہم سمجھ سکتے ہیں۔ بعض مراتب کا ادراک صرف اولیاء اللہ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان حضرات سے مخصوص ہے جو آپ کی دی ہوئی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔

سارا عالم اللہ کا نام ہے

سارا جہان اللہ کا نام ہے کیونکہ نام علامت اور نشانی ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ سب موجودات عالم حق تعالیٰ کی ذات مقدس کی نشانی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کچھ لوگ اس بات کی گہرائی تک پہنچ جاتے ہیں کہ موجودات کس طرح نشانی ہیں جبکہ دوسرے لوگ اس بات کو صرف مجمل طور پر سمجھ سکتے ہیں یعنی وہ اتنا جانتے ہیں کہ کوئی موجود خود بخود وجود میں نہیں آسکتا۔

کوئی ممکن خود بخود وجود میں نہیں آتا

یہ ایک واضح عقلی مسئلہ ہے۔ ہر انسان کی عقل فطری طور پر یہ جانتی ہے کہ جو موجود ایسا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ نہ ہو تو بھی ممکن ہے کہ اس کا وجود ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا وجود نہ ہو، لہٰذا ایسا ممکن الوجود یونہی خود بخود وجود میں نہیں آتا۔ ممکن کے لیے ضروری ہے کہ اس کے وجود کا سلسلہ ایک ایسے موجود تک پہنچے جو موجود بالذات ہو یعنی اس کا وجود اس سے سلب نہ

ہوسکے۔ یہ موجود ازلی ہوگا اور اس کا وجود قابل سلب نہیں ہوگا۔ دوسری موجودات جو ایسی ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ وہ موجود ہوں اور ہوسکتا ہے کہ موجود نہ ہوں، اس بات کی محتاج ہیں کہ باہر سے کوئی ان کو وجود میں لائے۔ اگر ہم فرض کرلیں کہ یہ بالائی خلا — جو محض خیالی ہے اور جب کچھ نہیں ہے تو خیالی ہی ہے اور واقع میں اس کا کوئی وجود نہیں — ہمیشہ سے ہے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ خلا، جو محض خلا ہے، خود بخود کسی موجود شے میں بدل جائے یا کوئی شے ایسے ہی اس میں پیدا ہو جائے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ابتداء میں دنیا ایک لامتناہی خلا تھا (لامتناہی ہونے میں جو اشکال ہے وہ اپنی جگہ ہے) اور بعد میں اس کے اندر ایک طرح کی ہوا یا گیس پیدا ہوئی اور اسی گیس سے دنیا کی ہر چیز پیدا ہوگئی تو یہ بات بالکل خلاف عقل ہے کہ کوئی چیز بغیر کسی خارجی سبب یا علت کے از خود کسی دوسری چیز میں بدل جائے۔ جو چیز کسی دوسری چیز میں بدلتی ہے اس کے لیے خارجی علت ضرور موجود ہوتی ہے ورنہ کوئی شے خود بخود کچھ اور نہیں بن جاتی مثلاً برف جمتی ہے تو اس کے لیے کوئی خارجی علت ضروری ہے جس کی وجہ سے پانی برف بن کر جم جائے یا پانی ابلتا ہے تو اس کے لیے بھی کوئی خارجی علت ضروری ہے۔ اگر پانی کا درجہ حرارت نہ صفر سے نیچے ہو اور نہ صفر سے اوپر تو ابد تک پانی پانی ہی رہے گا۔ اس میں تبدیلی کے لیے کوئی خارجی علت ضروری ہے۔ یہ اجمالی بیان ہوا اس کا کہ ہر معلول کے لیے ایک علت ضروری ہے اور ہر ممکن کسی علت کا محتاج ہے۔

جو شخص ذرا غور و فکر سے کام لے گا وہ یہ مان لے گا کہ جو چیز ایسی ہے کہ وہ ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ہوسکتی وہ (چیز) نہ خود بخود ہوتی ہے اور نہ خود بخود نہیں ہوتی۔ "نہ ہونا" کوئی چیز نہیں ہے کہ اس کے لیے بھی کسی

علت کی ضرورت ہو۔ نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی چیز علت کے بغیر کسی دوسری چیز میں بدل جائے اور نہ کوئی چیز بغیر علت کے وجود میں آسکتی ہے۔ یہ سب باتیں بدیہیات میں سے ہیں۔

موجودات اللہ کی نشانی ہیں

اتنی بات تو اجمالی طور پر سب سمجھ سکتے ہیں کہ سب موجودات عالم، اللہ کا نام اور اللہ کی نشانی ہیں اور پورا جہان ہی اسمائے الٰہی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہاں کچھ نام رکھنے کا سوال نہیں ہے۔ یہ ایسی بات نہیں کہ جیسے فرض کیجئے کہ ہم کسی کو چراغ سمجھا چاہتے ہیں تو اس کا نام لے دیتے ہیں مثلاً چراغ یا ایسے ہی موٹر یا انسان یا زید۔ یہ بات ایک ایسی ذات کے متعلق نہیں کہی جاسکتی جو اپنے تمام اوصاف کمال میں لامتناہی اور غیر محدود ہے۔

جو موجود محدود ہو وہ ممکن الوجود ہوتا ہے

اگر موجود محدود ہو تو وہ ممکن ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی موجودیت کی کوئی حد نہیں اس لیے اسے عقلاً تمام کمالات سے متصف ہونا چاہیے کیونکہ اگر ایک بھی کمال کم ہو تو وہ محدود ہو جائے گا اور محدود ہوا تو ممکن ہوگیا۔ ممکن اور واجب میں یہی فرق ہے کہ واجب ہر لحاظ سے لامتناہی اور موجود مطلق ہوتا ہے۔ باقی چیزیں متناہی اور محدود ہیں۔ اگر واجب میں تمام اوصاف لامتناہی اور غیر محدود نہ ہوں تو واجب پھر واجب نہیں رہے گا ممکن ہو جائے گا۔ واجب ایسا موجود ہے جو ایجاد اور وجود کا سرچشمہ ہے۔ وہ سب موجودات جو

اس سرچشمے سے وجود میں آئیں گی، وہ بھی ان تمام صفات کی جامع ہوں گی جو واجب میں پائی جاتی ہیں لیکن کچھ کمی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان موجودات کے بھی مختلف درجے ہیں۔ اعلیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ موجود میں جہاں تک ممکن ہے حق تعالیٰ کی سب صفات پائی جائیں اس حد تک کہ گویا وہ موجود بھی واجب ہے۔ ایسے ہی موجود کو اسم اعظم کہتے ہیں۔

اسم اعظم کیا ہے

اسم اعظم وہ نام اور وہ علامت ہے جس میں ایک طرح سے حق تعالیٰ کے سب کمالات پائے جائیں گو ناقص طور پر یعنی اس حد تک جس حد تک ایسا ہونا ممکن ہے۔ دوسری موجودات کے مقابلے میں اس میں سب کمالات الٰہی کامل طور پر ہوتے ہیں۔ دوسری موجودات میں بھی جو اسم اعظم کے بعد آتی ہیں کمالات پائے جاتے ہیں لیکن صرف ان کی حیثیت اور ظرف کے مطابق یہاں تک کہ وہ مادی موجودات آجاتی ہیں جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ وہ ہر کمال سے خالی ہیں۔ ان میں نہ علم ہے اور نہ قدرت لیکن ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی علم و ادراک سے خالی نہیں ہیں۔

سب موجودات تسبیح کرتی ہیں

چونکہ ہم حجاب میں ہیں اس لیے ہم اس کا ادراک نہیں کرسکتے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان موجودات میں بھی جو انسان اور حیوان سے کمتر اور ناقص ہیں سارے کمالات کا عکس پایا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان میں یہ کمالات ان کے وجود کے ظرف کے مطابق ہوتے ہیں یہاں تک کہ ادنیٰ

ترین مخلوقات میں بھی انسان کی طرح ادراک کی صفت موجود ہے۔

قرآن پاک میں ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم اُن کی تسبیح کو نہیں سمجھتے[1]

چونکہ ہم حجاب میں ہیں اور موجودات کی تسبیح کو نہیں سمجھتے اس لیے قدیم علماء کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ناقص موجود میں بھی ادراک ہوسکتا ہے، چنانچہ انھوں نے اس تسبیح کو تکوینی تسبیح پر محمول کیا حالانکہ اس آیت کا تکوینی تسبیح سے کوئی تعلق نہیں۔ تکوینی تسبیح کے متعلق ہمیں معلوم ہے مگر یہاں تکوینی تسبیح کا ذکر نہیں ہے۔ بہرحال بات یہ ہے کہ سب موجودات تسبیح کرتی ہیں مثلاً اس کنکری کی تسبیح کے قصے میں جو سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک میں تھی لوگوں نے اس کی تسبیح سنی تھی اور انھیں معلوم بھی ہوا تھا کہ وہ تسبیح کیا تھی۔ وہ ایسی تسبیح تھی جس سے ہمارے تمہارے کان ناآشنا ہیں۔ یہ تسبیح ایک بولی ہے لیکن ہماری بولی نہیں بلکہ ان کی اپنی بولی ہے۔ ان میں بھی ادراک ہے البتہ یہ کہ ان کا ادراک ان کے اپنے ظرف وجودی کے مطابق ہے۔ اونچے درجے کی مخلوق جو اپنے آپ کو ہر قسم کے ادراک کا سرچشمہ سمجھتی ہے اس کا خیال ہے کہ دوسری موجودات ادراک سے عاری ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ادراک کا یہ درجہ جو اسے حاصل ہے دوسری موجودات کو حاصل نہیں ہے۔ چونکہ ہم حجاب میں ہیں اس لیے ہمیں ان کے ادراک اور تسبیح کا علم نہیں اور چونکہ ہمیں علم نہیں اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ بات ہی کچھ نہیں۔

۱۔ سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۴۴

ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کا ہمیں علم نہیں

بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ان کا وجود نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا وجود ہے اگرچہ ہم ان سے ناواقف ہیں۔ آج بھی نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں مثلاً سب کا خیال تھا کہ نباتات بے جان ہیں لیکن اب کہا جا رہا ہے کہ ان میں سماعت کا نظام ہے اور اگر گرم پانی میں درخت کے ریشوں کو رکھ کر آواز گزاری جائے تو ردعمل ہوتا ہے اور جوابی آوازیں آتی ہیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ لیکن یہ تو صحیح ہے کہ یہ دنیا طرح طرح کی آوازوں سے بھری ہوئی ہے۔ سارا عالم زندہ ہے اور اللہ کا نام ہے۔ سب اللہ کا نام ہیں۔ ہر چیز اللہ کا نام ہے۔ آپ خود اسمائے الٰہی ہیں۔ آپ کی زبان بھی اسمائے الٰہی میں سے ہے۔ آپ کے ہاتھ بھی اسمائے الٰہی ہیں۔

تمام حرکات اسمائے الٰہی ہیں

آپ خدا کی جو حمد کرتے ہیں وہ بھی اسم الٰہی ہے۔ آپ جو بھی حرکت کرتے ہیں، وہ بھی اسم الٰہی ہے۔ گھر سے پاؤں دھو کر آپ مسجد جاتے ہیں تو اللہ کے نام کے ساتھ جاتے ہیں۔ آپ اللہ کے نام کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتے کیونکہ آپ خود اسم اللہ ہیں۔ آپ کے دل کی دھڑکن بھی اسم اللہ ہے۔ آپ کی نبض کی جنبش بھی اسم اللہ ہے۔ یہ ہوائیں جو چلتی ہیں سب اللہ کا نام ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں شاید یہی معنی مراد ہوں۔ اس کے علاوہ بھی متعدد آیات میں آیا ہے کہ اللہ کے نام کے ساتھ فلاں بات — بات اللہ کے نام کی ہے اور ہر چیز اللہ کا نام ہے یعنی "حق" ہے اور اسم الٰہی ہے۔ سب

کچھ وہی ہے۔ اسم فنا فی المسمّٰی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا بھی کوئی مستقل وجود ہے، ہم بھی کوئی چیز ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ اگر وہ ذات جس نے اپنے ارادے اور اپنی تجلی کی شعاعوں سے سب موجودات کو وجود بخشا ہے ایک آن، ایک پل کے لیے بھی اپنی تجلی اٹھا لے تو سب موجودات نیست و نابود ہو جائیں۔ اپنی حالت وجودی سے خارج ہو کر اپنی سابقہ حالت پر لوٹ جائیں کیونکہ ان کے وجود کی بقا کا دارومدار بھی اسی تجلی پر ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنی تجلی سے سارے عالم کو پیدا کیا ہے اور یہی تجلی اور نور وجود کی اصلی حقیقت ہے، اسم اللہ ہے۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ ہر چیز میں اس کا نور ہے۔ ہر چیز کا ظہور اس کے نور سے ہے۔ یہ ظہور خود نور ہے۔ انسان کا ظہور بھی نور ہے اس لیے انسان بھی نور ہے۔ اسی طرح حیوانات بھی نور ہیں۔ سب مخلوقات نور ہیں۔ سب اللہ کا نور ہیں۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی آسمانوں اور زمین کا وجود جو ایک نور ہے، اللہ کی طرف سے ہے۔

یہ نور اس طرح فنا فی اللہ ہے کہ فرمایا اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ بِاللّٰہِ یُنَوَّرُ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ یعنی آسمان اور زمین اللہ کے نور سے منور ہیں۔ بات یہ ہے کہ آسمان اور زمین سب ہیچ ہیں۔ ہماری دنیا میں کوئی ایسا موجود نہیں جس کا کسی طرح سے مستقل وجود ہو۔ مستقل وجود کے معنی یہ ہیں کہ وہ حد امکان سے خارج ہو کر وجوب کے درجے تک پہنچ جائے حالانکہ اصل میں حق تعالیٰ کے سوا کسی موجود کا وجود نہیں، اس لیے فرمایا ہے بِسْمِ اللّٰہِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ،

۱۔ سورۂ نور: آیت ۳۵

بِسۡمِ اللّٰہِ قُلۡ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ شاید یہاں مراد یہ نہیں ہے کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کہو بلکہ ایک واقعہ کا بیان ہے اور وہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے نام سے کہو سے مراد یہ ہے کہ تمہارا یہ کہنا بھی اللہ کا نام ہے۔

قرآن مجید میں صرف یہ نہیں فرمایا گیا کہ یُسَبِّحُ لَہٗ "مَنۡ" فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ[1] جس کا مطلب ہوتا ہے کہ زمین و آسمان میں موجود "ہر شخص" تسبیح کرتا ہے بلکہ اس مضمون کو وسعت دی گئی ہے۔ ارشاد ہوا یُسَبِّحُ لَہٗ "مَا" فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ[2] یعنی "ہر چیز" اللہ کی تسبیح کرتی ہے خواہ آسمانوں میں ہو یا زمین میں۔

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے، وہ سب اللہ کے نام سے تسبیح کرتی ہیں کیونکہ سب اسی کا جلوہ ہیں۔ سب موجود کا وجود اسی کے جلوے سے ہے۔ جو "حرکت" بھی ہوتی ہے اسی جلوے سے ہوتی ہے۔

دنیا کی تمام چیزیں اسی کا جلوہ ہیں

دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کے جلوے سے ہوتا ہے۔ سب کام اور سب چیزیں اسی کی طرف سے ہیں اور اسی کی طرف لوٹتی ہیں۔ کسی مخلوق کے پاس اپنی خود کی کوئی چیز نہیں۔ خود کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی کھڑا ہو کر یہ کہتا ہے کہ میرے خود کے پاس کوئی چیز ہے تو اس کے معنی سرچشمۂ نور کے ساتھ مقابلے کے ہیں۔ میرے اپنے پاس بھی کچھ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ میری ہستی میری اپنی ہے حالانکہ جب تمہارا وجود تمہارے اپنے پاس

۱۔ سورۂ نور: آیت ۴۱

۲۔ سورۂ حشر: آیت ۲۴

ہے تب بھی تمہارا نہیں۔ یہ آنکھ جو تمہارے پاس ہے یہ بھی تمہاری نہیں۔ یہ آنکھ اسی کے جلوے سے وجود میں آئی ہے۔ یہ حمد و ثناء جو ہم کرتے ہیں یا اور لوگ کرتے ہیں، یہ سب اسم الٰہی سے ہے یا اسم الٰہی کی وجہ سے ہے۔

اسی لیے فرمایا: بِسۡمِ اللّٰہِ، اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ.

اللہ جامع جلوہ ہے

لفظ اللہ حق تعالیٰ کا ایسا جلوہ ہے جس میں سب جلوے شامل ہیں۔

رحمان و رحیم اس جلوے کے جلوے ہیں۔

رحمان نے اپنی رحمت و رحمانیت سے تمام موجودات کو وجود بخشا ہے۔ یہ رحمت ہے۔ وجود خود رحمت ہے حتیٰ کہ وہ وجود بھی سراپا رحمت ہے جو موذی موجودات کو عطا کیا گیا ہے۔ اسی کی وسیع رحمت تمام موجودات پر سایہ فگن ہے یعنی سب مخلوقات عین رحمت ہیں۔ اللہ کے نام سے ہی وہ جلوہ ہے جو ہر معنی میں جلوہ ہے۔

اللہ ایک مقام ہے جس سے پورے معنی میں جلوے کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ ایک جامع نام ہے۔ ایک ایسا نام ہے جو خود جلوہ ہے ورنہ حق تعالیٰ کی ذات ہی اس کا نام ہے۔ لَا اِسۡمَ لَہٗ وَلَا وَسۡمَ لَہٗ اس کی ذات سے الگ اس کا نہ کوئی نام ہے نہ نشان۔ اس کے نام اللہ، رحمان، رحیم سب اس کے جلوے ہیں۔ اللہ کے نام کے ساتھ جو ایسا نام ہے کہ اس سے سب کمالات کا ظہور ہوتا ہے رحمان اور رحیم کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ رحمت، رحمانیت اور رحیمیت پر دلالت کرتے ہیں۔ غضب اور انتقام کی صفات بالذات نہیں ہیں بلکہ ان صفات کی تابع ہیں جبکہ رحمت، رحمانیت اور رحیمیت بالذات ہیں۔

دوسری صفات ان کے تابع ہیں۔ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ ، اللہ ، رحمان اور رحیم کے نام کے ساتھ سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ دنیا میں جس کمال کی بھی تعریف و ستائش ہوتی ہے وہ اسی کی حمد بن جاتی ہے۔ آدمی کوئی کھانا کھاتا ہے تو اس کی تعریف کرتا ہے کہ کیا مزیدار کھانا تھا۔ اگرچہ آدمی خود نہیں سمجھتا لیکن یہ دراصل خدا کی تعریف ہے۔ آدمی کسی دوسرے کے متعلق کہتا ہے کہ وہ کتنا اچھا آدمی ہے۔ کتنا بڑا فلسفی اور عالم ہے۔ یہ بھی خدا ہی کی حمد و ثنا ہے کیونکہ فلسفی اور عالم کا اپنا کچھ نہیں ہے، جو کچھ بھی ہے خدا کا جلوہ ہی ہے۔ جس نے اس بات کو سمجھا اور عقل سے سمجھا، وہ بھی اور اس کی عقل بھی دونوں خدا کا جلوہ ہیں۔

کوئی تعریف کسی اور کی تعریف نہیں ہے

کوئی تعریف غیر اللہ کی نہیں ہوتی کیونکہ ہم جب بھی کسی کی تعریف کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس میں یہ خوبی ہے۔ یہ اچھائی ہے۔ نہ ہونے کی تو تعریف نہیں کی جاتی اور جو کچھ بھی ہے اسی کا ہے۔ جس بات کی بھی تعریف کی جائے اسی کی تعریف ہے۔ جو حمد و ثنا کی جائے گی وہ اسی کی ہوگی۔ اَلۡحَمۡدُ کے معنی ہیں سب تعریفیں۔ جو کچھ بھی تعریف ہے درحقیت خدا کی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ زید کی تعریف کر رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عمرو کی تعریف کر رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سورج کی روشنی یا چاند کی چاندنی کی تعریف کر رہے ہیں لیکن ہم حجاب میں ہیں، ہم نہیں جانتے کیونکہ حقیقت ہم سے پوشیدہ ہے۔

جب پردہ اٹھے گا تو ہم دیکھیں گے کہ سب تعریفیں اسی کے لیے

ہیں۔ یہ اسی کا جلوہ ہے کہ ہم اس کی تعریف کر رہے ہیں۔

اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ یعنی ہر خوبی اسی کی ہے۔ سب کمالات اسی کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سب اسی کا جلوہ ہے یا یوں کہیے کہ سارے عالم کا جلوہ اسی سے ہے اور سارا عالم اسی کا جلوہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ کر رہے ہیں۔

وَمَا رَمَيۡتَ اِذۡ رَمَيۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى[1] "جب آپ نے (تیر) پھینکا تو آپ نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔" آپ نے پھینکا اور آپ نے نہیں پھینکا کیونکہ یہ پھینکنا بھی ایک اور پھینکنے کا جلوہ ہے اور پھینکنا خود بھی ایک جلوہ ہے۔ لٰكِنَّ مَا رَمَيۡتَ جلوہ ہے اِنَّ اللّٰهَ رَمٰى کا۔

ایک اور آیت ہے کہ جن لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی انھوں نے اللہ سے بیعت کی۔ یہ ہاتھ بھی خدا کا جلوہ ہے۔ ہم چونکہ حجاب میں ہیں اس لیے اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ہم سب حجاب میں ہیں سوائے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جن کو اللہ نے تعلیم دی اور ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم سے مستفیض ہوئے۔

یہ ایک احتمال ہے کہ شاید 'باسم' کا تعلق 'الحمد' سے ہو یعنی خدا کے نام کے ساتھ سب تعریفیں اللہ کی ہیں۔ یہ خدا کا جلوہ ہے جو سب تعریفوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور کوئی تعریف کسی غیر کی تعریف نہیں ہونے پاتی۔ کوئی کتنی ہی غیر کی تعریفیں کرے ہر تعریف اسی کی ہوگی۔ کتنا ہی غور کیجیے آپ غیر کا کہیں پتا نہیں پائیں گے اور کتنا ہی زور لگائیے کہ غیر کے متعلق کچھ بات کیجیے تو نہیں کر سکیں گے کیونکہ غیر از خدا تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ جو کچھ

۱۔ سورۂ انفال: آیت ۱۷

آپ کہیں گے وہ اسی کے متعلق ہوگا۔ نقائص معدوم ہیں۔ جو چیز وجود میں آتی ہے اس کے دو پہلو ہوتے ہیں:

ایک وجودی پہلو

دوسرا نقص یا لا کا پہلو

وجودی پہلو نور ہے جس میں کوئی نقص نہیں ہوتا اور وہ نقائص سے پاک ہوتا ہے۔ نقص اس سے نہیں ہے لا اس سے نہیں ہے۔ تعریف ہمیشہ ''ہے'' کی ہوتی ہے ''نہیں'' کی نہیں ہوتی۔

تعریف ہمیشہ وجود، ہستی اور کمال کی ہوا کرتی ہے، کمال کا اس دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے۔ صرف ایک ہی کمال ہے اور وہ اللہ کا کمال ہے۔ جمال بھی صرف اللہ کا جمال ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کو سمجھیں اور اپنے دل کو سمجھائیں۔ اگر ہم یہی ایک بات دل کو سمجھا سکیں تو پھر کوئی بات ہی نہ ہو۔ بات کرنا آسان ہے لیکن قابل فہم بات کا بھی دل کو اس طرح سمجھانا کہ اسے یقین آجائے مشکل ہے۔ کبھی آدمی محض زبان سے کہتا ہے کہ جہنمی ہے، جنتی ہے۔ کبھی اس کو اس کا یقین بھی ہوتا ہے۔

یقین کرنا اور ہے اور علمی اعتقاد اور ہے

دل سے یقین کرنا علمی اعتقاد سے مختلف چیز ہے۔ علمی دلائل سے کسی بات کا ثابت ہونا ایک الگ بات ہے اور اس کا واقعی دل میں جم جانا بالکل الگ بات۔ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا راز اسی مکمل یقین میں پوشیدہ ہے۔ جب کسی بات کا یقین آگیا تو پھر اس کے خلاف عمل ممکن ہی نہیں رہا۔ اگر آپ کو اس بات کا پختہ یقین ہو کہ ایک آدمی تلوار سونتے ہوئے آپ کے

سر پر کھڑا ہے کہ اگر آپ نے اس کے خلاف کوئی لفظ کہا تو وہ آپ کی گردن مار دے گا تو چونکہ آپ کو اپنی جان عزیز ہے اس لیے اس کا امکان ہی نہیں کہ آپ اس کے خلاف زبان ہلائیں گے۔ گویا آپ اس معاملے کی حد تک معصوم ہوگئے۔ جس کو اس کا یقین آگیا کہ اگر اس نے چغلی کھائی تو یہ چغلی اسے ایک ایسے بھیانک جانور کی شکل بن کر کچلنے لگے گی جس کی زبان اتنی لمبی ہوگی کہ جہاں وہ ہے وہاں سے لے کر جہاں وہ شخص ہے جس کی غیبت کی گئی وہاں تک پہنچے گی تو وہ کبھی غیبت نہیں کرے گا۔ اگر کسی کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ غیبت اِدَامُ کِلَابِ النَّارِ یعنی جہنم کے کتوں کی غذا ہے اور غیبت کرنے والے کو جہنم کے کتے نگلیں گے اور نگلتے ہی رہیں گے اور نگلنا کبھی ختم نہیں ہوگا تو وہ ہرگز غیبت نہیں کرے گا۔ یہ جو ہم کبھی کبھی کسی کی غیبت کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم ان باتوں کو پوری طرح دل سے نہیں مانتے۔

اعمال وافعال ٹھوس شکل اختیار کرلیں گے

اگر آدمی کو اس کا یقین ہو جائے کہ جو کام بھی وہ اس دنیا میں کرتا ہے وہ سب اگلی دنیا میں مجسم صورت اختیار کرلیں گے — اگر اچھے اعمال ہیں تو ان کی اچھی صورت ہوگی اور اگر برے اعمال ہیں تو ان کی بری صورت ہوگی اور ہر چیز کا حساب دینا ہوگا — تو وہ برے کام بھول کر بھی نہ کرے۔ اس معاملے کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا کافی ہے کہ ہر کام کا محاسبہ ہوگا۔

چنانچہ اگر کوئی غیبت کرے گا تو وہاں اس کا محاسبہ ہوگا اور سزا ملے گی۔ اگر مومنین کو ایذا دے گا تو جہنم میں جائے گا اور اگر خیرات و برات اس

کے نامہ اعمال میں ہوں گی تو بہشت ملے گی۔ اس کا یقین آجانے کی بات ہے۔ صرف کتاب میں پڑھ لینا اور عقلی طور پر سمجھ لینا کافی نہیں کیونکہ عقلی ادراک اور قلبی یقین ایک دوسرے سے بہت دور اور مختلف ہیں۔ قلب سے میری مراد یہ قلب نہیں بلکہ قلب حقیقی ہے۔

مان لینے اور عقلی طور پر سمجھ لینے میں فرق ہے

بسا اوقات آدمی کسی بات کو سمجھتا اور جانتا ہے لیکن چونکہ اسے اس بات پر پختہ یقین نہیں ہوتا اس لیے وہ اس کے مطابق عمل نہیں کرتا۔ جب بات دل میں پوری طرح بیٹھ جاتی ہے تو عمل کرنے لگتا ہے۔

ایمان اسی یقین محکم کا نام ہے۔ پیغمبر کے متعلق علم ہونے سے فائدہ نہیں ہوتا۔ پیغمبر پر ایمان لانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ کے وجود پر دلائل قائم کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کی ذات پر ایمان ضروری ہے یعنی پختہ یقین رکھنا اور دل کو اس کے تابع فرمان کرنا۔ بخدا اگر ایمان ہو تو سب باتیں خود بخود ہو جاتی ہیں۔

اگر آدمی کو یقین ہو جائے کہ ایک ذات اس عالم کا سرچشمہ ہے، آدمی سے باز پرس ضرور ہوگی۔ مرنے کے بعد آدمی فنا نہیں ہو جائے گا کیونکہ مرنے کے معنی ہیں ایک ناقص درجے سے درجۂ کمال کی طرف منتقل ہونا۔ اگر آدمی کو اس بات کا یقین ہو جائے تو وہ تمام لغزشوں سے بچ جائے۔ سوال صرف یہ ہے کہ یہ یقین کس طرح آئے؟ اس آیت کریمہ میں جو فرمایا گیا ہے بِسۡمِ اللّٰہِ، اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ اللہ کے نام سے سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں تو اس کے ایک پہلو کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں۔ پھر کہتا ہوں کہ میں یقین

سے نہیں کہتا لیکن احتمال یہ ہے کہ اگر آدمی کو یقین آجائے کہ سب تعریفیں اسی کی ہیں تو اس کے دل میں شرک کا خیال ہی نہ آئے کیونکہ جو کوئی کسی کی تعریف کرتا ہے وہ خدا کے جلوے کی تعریف ہوتی ہے۔

اگر کوئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا حضرت امیر علیہ السلام کی شان میں قصیدہ کہتا ہے یا کہنا چاہتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ قصیدہ خدا کے لیے ہے کیونکہ پیغمبر اسلامؐ اور حضرت امیرؑ خدا کا عظیم جلوہ ہیں اور چونکہ آپ خدا کا جلوہ ہیں اس لیے آپ کی مدح خدا کی مدح اور اس کے جلوے کی مدح ہے۔ اگر آدمی کو یقین ہو کہ سب تعریفیں اللہ ہی کی ہیں تو وہ خودنمائی چھوڑ دے۔ یہ جو آدمی اس قدر شیخی بگھارتا ہے اور غرور کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔ مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَهٗ فَقَدۡ عَرَفَ رَبَّهٗ[1] جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔

آدمی نہیں جانتا کہ وہ خود کچھ نہیں۔ اگر وہ یہ سمجھ لے اور اسے یہ یقین ہو جائے کہ جو کچھ ہے، خدا کا ہے تو وہ اپنے پروردگار کو پہچانتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم نہ خود کو پہچانتے ہیں نہ خدا کو، نہ ہمیں اپنے آپ پر ایمان ہے نہ خدا پر۔ نہ ہمیں یہ یقین ہے کہ ہم کچھ نہیں ہیں اور نہ ہمیں یہ یقین ہے کہ جو کچھ ہے سب خدا کا ہے۔ جب یہ یقین نہ ہو تو خدا کے وجود کے جتنے بھی دلائل دیے جائیں سب بیکار ہیں۔ انانیت ہر کام میں شامل ہے اور یہ کہ میں کیا ہوں اور تم کیا ہو۔ ریاست و زعامت کے یہ دعوے انانیت ہی کی وجہ سے ہیں۔ یہ انانیت اسی وقت ہوتی ہے جب آدمی خود بین ہوتا ہے۔

۱۔ یہ حضرت امیر المومنین امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا ارشاد ہے۔
(غرر الحکم و درر الکلم، آمدی)

انسان پر سب مصیبتیں حب نفس کی وجہ سے آتی ہیں

انسان پر جو مصیبتیں آتی ہیں حب نفس کی وجہ سے آتی ہیں کیونکہ آدمی اپنی ذات سے محبت کرتا ہے حالانکہ اگر وہ غور کرے اور سمجھے تو اس کی ذات کوئی چیز نہیں، یہ دوسرے کی چیز ہے، اس لیے حب نفس درحقیقت حب غیر ہے۔ غلطی سے اس کا نام حب نفس رکھ دیا گیا ہے۔ یہی غلطی آدمی کو خراب کرتی ہے۔ جو تکلیفیں ہم سب پر آتی ہیں ان کی اصل وجہ یہی حب نفس اور حب جاہ ہے۔ حب جاہ ہی ہے جو انسان کو قتل کراتی ہے، اس کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے اور جہنم میں لے جاتی ہے۔ حب نفس اور حب جاہ رَاْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ یعنی ہر لغزش اور برائی کی جڑ ہیں۔ جب انسان خودبین اور خودپسند ہو جاتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ ہر چیز پر خود ہی قبضہ کرلے اور غلط یا صحیح جس کو اپنے راستے میں رکاوٹ سمجھتا ہے اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔ وہ ہر بات اپنے ہی لیے چاہتا ہے اور کسی طرح کی حدود و قیود کا قائل نہیں رہتا۔ یہی بات سب مصیبتوں اور تکلیفوں کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

سب تعریفیں اسی کی ہیں

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کتاب الٰہی کی ابتداء ایک ایسے مضمون سے ہوئی ہے جو تمام مسائل پر حاوی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سب تعریفیں اللہ کی ہیں تو شاید سب ہی مسائل سامنے آجاتے ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ کچھ تعریفیں اللہ کی ہیں۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے لیکن میں تعریف تمہاری کر رہا ہوں خدا کی نہیں، جب بھی سب تعریفیں اللہ ہی کی ہیں۔

جب یہ فرمایا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تعریف کی سب اقسام ہر لحاظ سے اللہ کی ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ کسی اور کی تعریف کر رہے ہو۔ یہی ایک آیت تمام مسائل پر سے پردہ اٹھا دیتی ہے — اگر اسی ایک آیت پر آدمی کو پورا یقین ہو — واضح رہے کہ بات یقین کی ہے — تو یہی ایک کلمہ انسان کے قلب کو ہر طرح کے شرک سے پاک کرنے کے لیے کافی ہے۔ جس شخص نے یہ کہا ہے کہ میں نے شروع سے آخر عمر تک کسی طرح کا شرک نہیں کیا تو اس کے ایسا کہنے کی وجہ یہی ہے کہ اس نے اپنے وجدان سے اس حقیقت کو معلوم کرلیا اور یہ حقیقت اس کے ضمیر میں جاگزیں ہوگئی ہے۔ دلیل اور برہان سے یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی۔ دلیل اپنی جگہ اچھی چیز ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دلیل اچھی چیز نہیں۔ اس کی بھی ضرورت ہے لیکن دلیل محض ایک ذریعہ ہے کسی مسئلے کو اپنی عقل کے مطابق سمجھ لینے کا۔ پہلے سمجھے اور پھر کوشش کرکے اس پر ایمان لے آئے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود

فلسفہ محض ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ یہ مسائل و معارف کو عقلی طور پر دلائل سے سمجھ لینے کا ایک ذریعہ ہے۔ دلائل کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ بات عقل میں آجائے۔ ''پائے استدلالیاں چوبیں بود'' کا مطلب یہی ہے کہ دلائل لکڑی کے پاؤں ہیں۔ وہ پاؤں جن سے آدمی واقعی راستا طے تو کرسکتا ہے لیکن وہ پاؤں جن سے آدمی قطعاً راستا طے کرسکے اور جلوۂ الٰہی کو دیکھے وہ ایمان ہے۔ وہ ایمان جو انسان کے دل میں جاگزیں ہو جائے اور وہ وجدان اور ذوق ہے جو ایمان کا سبب بنے۔ یہ درجہ بھی ایک ادنیٰ درجہ ہے۔ اس سے

اونچے درجے بھی ہیں۔

امید ہے کہ انشاء اللہ ہم صرف قرآن کی تلاوت اور اس کی تفسیر پڑھنے پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ ہر مسئلے اور قرآن کے ہر لفظ پر مکمل یقین رکھیں گے۔ یہ وہ کتاب ہے جو آدمی کی اصلاح کرتی ہے اور اسے ایسا موجود بنانا چاہتی ہے جسے خدا نے خود ایجاد کیا ہے اور اسم اعظم سے ایجاد کیا ہے۔ اللہ نے آدمی کو سب کچھ دیا ہے مگر اس کی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی کو اس ناقص درجے سے اٹھا کر اس اعلیٰ درجے تک پہنچا دے جو اس کے لیے مناسب ہے۔ قرآن اسی لیے آیا ہے۔ سب انبیاء و رسل اسی لیے آئے ہیں کہ انسان کی دستگیری کریں، اسے نفسانیت کے عمیق ترین کنوئیں سے نکالیں جس میں وہ گرا ہوا ہے اور اسے جلوۂ حق دکھائیں تاکہ وہ حق کے سوا سب کچھ بھول جائے۔ خدا کرے کہ اس کے فضل سے یہ نعمت ہمیں بھی نصیب ہو۔

دوسرا درس

أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

ہر سورت کی بسم اللہ مختلف ہے

بات یہ ہو رہی تھی کہ بسم اللہ میں جار و مجرور کا تعلق کس لفظ سے ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک احتمال یہ ہے کہ ہر سورت کی بسم اللہ کا تعلق اسی سورت کے کسی مناسب لفظ سے ہو جیسے سورۂ الحمد میں حمد سے۔

بِسْمِ اللهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ کے نام سے، سب تعریف اللہ کی ہے۔ اس احتمال کی بنا پر ہر سورت میں بسم اللہ کے معنی مختلف ہوں گے کیونکہ ہر سورت میں بسم اللہ کا تعلق اسی سورت کے کسی مناسب لفظ سے ہوگا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سورۂ الحمد میں بسم اللہ کا تعلق حمد سے ہے تو پھر دیکھنا ہوگا کہ وہ کون سا اسم ہے جو ذات حق سے ذات حق کے لیے ظاہر ہوتا ہے اور اس اسم سے حمد واقع ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی دوسری سورت مثلاً سورۂ اخلاص میں دیکھنا ہوگا کہ اس سورت میں وہ کون سا اسم جو بِسْمِ اللّٰهِ کے مناسب ہے۔ فقہ میں بھی یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی نے کسی سورت کے ساتھ بسم اللہ پڑھی اور پھر کوئی دوسری سورت پڑھنی چاہی تو پہلی بسم اللہ کافی نہیں ہوگی بلکہ دوبارہ بسم اللہ پڑھنی ضروری ہے۔ اس کے بھی یہی معنی ہوئے کہ ایک بسم اللہ دوسری بسم اللہ سے مختلف ہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ سب جگہ بسم اللہ

کے ایک ہی معنی ہوتے تو پھر ایک سورت کی بسم اللہ اور دوسری سورت کی بسم اللہ میں فرق نہ ہوتا چنانچہ بعض لوگ اس بات کے قائل بھی ہیں کہ اصولی طور پر بسم اللہ کسی سورت کا جزو نہیں اور یہ کہ سورۂ الحمد میں بسم اللہ محض برکت کیلئے آئی ہے لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سورۂ الحمد میں بسم اللہ کے جار و مجرور کا تعلق حمد سے ہے تو ایک احتمال یہ ہے کہ الحمد میں ہر وہ حمد شامل ہو جس پر حمد کا لفظ صادق آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو حمد کرنے والا بھی حمد کرتا ہے وہ اللہ کے اسم سے ہوتی ہے کیونکہ حمد کرنے خود بھی ایک اسم ہے۔ اس کے اعضاء و جوارح بھی اسم ہیں۔ انسان جو حمد کرتا ہے وہ بھی ایک اسم ہے۔ اس لحاظ سے بھی ہر حمد اللہ کے اسم سے ہوتی ہے۔ آپ خود بھی ایک اسم ہیں۔ زید بھی ایک اسم ہے۔ سب اسمائے الٰہی ہیں یعنی اسماء کے مظاہر کیونکہ یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں۔ اللہ ان کا وجود میں لانے والا یا فاعلِ وجود ہے۔ فاعلِ وجود اور فاعلِ طبیعی میں کئی لحاظ سے فرق ہے۔ ایک فرق یہ ہے کہ جو شے مبداء الٰہی سے صادر ہوتی ہے جسے فاعل الٰہی بھی کہتے ہیں وہ اسی مبداء و مصدر میں فنا ہوتی ہے۔ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ایک مثال سے یہ بات کسی حد تک سمجھ میں آسکتی ہے۔ اگرچہ یہ مثال موجودات اور فاعل الٰہی پر پوری طرح منطبق نہیں ہوتی کیونکہ ان کا تعلق اس مثال سے بہت بلند ہے۔ بہرحال سورج اور اس کی شعاعوں کی مثال لیجئے۔ شعاعوں کا سورج سے الگ کوئی وجود نہیں۔ یہی صورت فاعل الٰہی کی ہے۔ اس سرچشمۂ خیر سے جو بھی وجود میں آتا ہے اس کی کسی لحاظ سے کوئی آزاد حیثیت نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنی پیدائش کے وقت بھی اس سرچشمے کا محتاج ہے اور اسی طرح اپنی بقا کے لیے بھی۔ کوئی بھی موجود ایسا نہیں ہے کہ اگر اللہ اس سے

وجود کی وہ روشنی ایک لمحے کے لیے بھی ہٹالے جس سے اس کا وجود قائم ہے تب بھی وہ موجود باقی رہ سکے۔ چونکہ کسی موجود کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں اس لیے وہ اپنے سرچشمے میں گم اور فنا ہے۔

ہر ممکن اپنے تحقق اور بقا دونوں میں محتاج ہے

ممکن اللہ کا نام، اللہ کا فعل، زمین و آسمان کا نور اور نور خدا کا ظہور ہے۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ خدا کے نور کا ظہور ہے لیکن عین خدا نہیں ہے۔ ممکن، جو ظاہر ہے اس کا مبداء ظہور سے ایسا تعلق ہے کہ ظاہر مبداء ظہور میں اس طرح فنا ہے کہ اس کا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں، اس لیے کہا گیا ہے کہ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.

اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ الحمد میں الف لام استغراق کا ہے اور بسم اللہ اس سے متعلق ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ جو بھی حمد کرنے والا کوئی حمد کرتا ہے اس کا تحقق بسم اللہ سے ہوتا ہے۔ حمد کرنے والا چونکہ خود اسم اللہ ہے، اس لیے ایک لحاظ سے حامد اور محمود (حمد کرنے والا اور جس کی حمد کی جاتی ہے) دونوں ایک ہی ہیں۔ ایک ظہور ہے، دوسرا مظہر ہے اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ اَنَا اَعُوْذُبِكَ مِنْكَ (تو ایسا ہی ہے جیسے کہ تو نے خود اپنی تعریف کی ہے، میں تجھ سے تیری پناہ مانگتا ہوں) چونکہ حامد، محمود میں فنا ہے اس لیے گویا محمود خود اپنی تعریف کرتا ہے اور چونکہ کسی دوسرے کی کوئی حیثیت ہی نہیں اس لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کی تعریف کرتا ہوں۔ وہ خود ہی اپنی تعریف کرتا ہے کیونکہ حامد (تعریف کرنے والا) محمود (جس کی تعریف کی جاتی ہے) میں فنا ہے۔

ایک اور احتمال یہ ہے کہ الحمد میں الف لام استغراق کا نہ ہو جو کثرت پر دلالت کرتا ہے بلکہ بغیر کسی تعین اور بغیر کسی خصوصیت کے مطلق حمد مراد ہو۔ اس صورت میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں حمد سے مراد ہوگی مطلق حمد بلا تعیین۔ اس احتمال کی صورت میں معنی پہلے احتمال کے برعکس ہوں گے اور ہماری حمد فی الواقع اللہ کی حمد نہیں ہوگی۔ فقط اس کی اپنی ہی کی ہوئی حمد اس کی ہوگی کیونکہ اس کی ذات غیر محدود ہے اور دوسرا جو کوئی بھی حمد کرتا ہے اس کی حمد متعین اور محدود ہوتی ہے۔ محدود جو حمد کرتا ہے، وہ غیر محدود کی حمد نہیں ہوتی۔ پہلے احتمال کی صورت میں ہم نے کہا تھا کہ ہر حمد خدا ہی کی ہوتی ہے یہاں تک کہ جب آپ سمجھتے ہیں کہ کسی خوبصورت خط کی تعریف کر رہے ہیں تب بھی وہ درحقیقت خط کی نہیں بلکہ اللہ کی تعریف ہوتی ہے، جب آپ کا خیال ہوتا ہے کہ آپ دنیا کی تعریف کر رہے ہیں تب بھی وہ اللہ ہی کی تعریف ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ہم نے کہا تھا کہ ہر حمد چاہے حمد کرنے والا کوئی بھی ہو، اسی کی حمد ہوتی ہے اور اسی کو پہنچتی ہے کیونکہ دنیا میں نہ کوئی کمال ہے نہ جمال۔ کمال بھی فقط اسی کا ہے اور جمال بھی اسی کا۔ اللہ کے سوا کسی بھی چیز کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ اگر اللہ اپنا جلوہ اٹھا لے تو موجودات میں سے کوئی چیز بھی باقی نہ رہے۔

موجودات خدا کا جلوہ ہیں

موجودات کا وجود خدا کے جلوے سے ہے۔ پہلے احتمال کی صورت میں ہم نے یہ کہا تھا کہ موجودات خود خدائے عزوجل کا جلوہ اور نور ہیں اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اگر جلوہ ہٹا لیا تو کسی موجود کا وجود باقی نہ رہے۔

چونکہ موجودات خدا کا جلوہ ہیں اور مدح کمال ہی کی ہوا کرتی ہے لہٰذا کوئی تعریف بھی غیر اللہ کی نہیں ہوتی اس لیے کہ ذات باری کے کمال کے علاوہ کوئی کمال ہے ہی نہیں۔ وہی کمال ہے، وہی ظہور کمال ہے، اس کی ذات میں بھی کمال ہے، صفات میں بھی کمال ہے، مقام ظہور میں بھی کمال ہے اس لیے سارے عالم کے کمالات اسی کا کمال ہیں۔ جو کوئی کسی کی مدح کرتا ہے وہ کمال کی مدح ہونے کے باعث اس کی مدح ہوتی ہے، اسی کے لیے ہوتی ہے۔ یہ بات پہلے احتمال کی صورت میں تھی۔ دوسرے احتمال کی صورت میں گو وہ بھی احتمال ہی ہے حمد، مطلق ہوگی نہ کہ کُلِّ حمد۔ حمد مطلق سے مراد وہ حمد ہے جس میں نہ کوئی قید ہو نہ غیر کا تصور اس میں شامل ہو۔ جو حمد ہم کرتے ہیں وہ بالکلیہ حمد متعین اور متعین کی حمد ہے کیونکہ موجود مطلق تک ہماری رسائی نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں اس کا ادراک ہے اس لیے ہم اس کی حمد کیسے کر سکتے ہیں آپ جب اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہتے ہیں، اس وقت بھی آپ کو اس حقیقت الحقائق کا ادراک نہیں ہوتا کہ آپ اس کی حمد کر سکیں۔

جو حمد بھی کی جاتی ہے وہ اللہ کی حمد نہیں ہوتی، اس کے مظاہر کی حمد ہوتی ہے۔ پچھلے احتمال کی صورت میں کوئی بھی حمد خدا کی نہیں ہوتی سوائے اس حمد کے جو وہ خود اپنی کرتا ہے۔ اس صورت میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں اسم کے بھی وہ معنی نہیں ہو سکتے جو ہم نے پہلے بیان کیے تھے کہ آپ بھی اسم ہیں، وہ بھی اسم ہے اور دوسرے بھی اسم ہیں۔ اب اسم اللہ علامت ہے ظہور مطلق بے قید کی جس کا ظہور بھی غیب ہے اور اسم بھی غیب۔ اسی اسم کی حمد ہوتی ہے یعنی وہ حمد جو خدا خود اپنی کرتا ہے۔ یہ بھی ایک احتمالی قول ہے اس بنیاد پر کہ بسم اللہ کا تعلق حمد سے ہو۔ ایک احتمال کی بنا پر حمد سے

مراد حمد کا ہر مصداق ہے اور دوسرے احتمال کی بنا پر مطلق حمد بلا کسی قید کے۔

ایک صورت میں کوئی بھی حمد غیر خدا کی حمد نہیں ہوتی۔ دوسری صورت میں کوئی حمد، مطلق حمد کے معنی میں خدا کی نہیں ہوتی البتہ محدود حمد ہوتی ہے۔ اس صورت میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے معنی ہوں گے کہ مطلق حمد بلا کسی قید کے۔ اللہ کی حمد صرف اس نام سے ہوتی ہے جو اس کے شایاں ہے۔ یہ بھی فقط ایک احتمال ہے۔ ایک اور احتمال یہ ہے کہ بسم اللہ کا تعلق سورت سے ہی نہ ہو۔ چنانچہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ بسم اللہ جار و مجرور فعل مقدر ظَھَرَ سے متعلق ہیں یعنی ظَھَرَ الْوُجُوْدُ اب بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے معنی یہ ہوئے کہ جو چیز بھی وجود میں آتی ہے وہ اللہ ہی کے نام سے وجود میں آتی ہے یعنی اللہ کا نام تمام موجودات کے ظہور کا سرچشمہ ہے۔ یہ اللہ کا نام وہی ہے جس کے متعلق ایک روایت میں ان الفاظ میں آئی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ الْمَشِیَّۃَ بِنَفْسِھَا وَ خَلَقَ الْاَشْیَاءَ بِالْمَشِیَّۃِ اللہ نے مشیت کو خود اسی سے پیدا کیا اور باقی چیزوں کو مشیت سے پیدا کیا۔

مشیت سے مراد وہی ظہور اول ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بلاواسطہ تخلیق کیا ہے۔ باقی سب چیزوں کی تخلیق مشیت سے ہوئی ہے۔ یہ وہی وجود ہے جو ظَھَرَ الْوُجُوْدُ میں ہے۔ اس احتمال کی بنا پر کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا تعلق سورت سے نہیں بلکہ کسی خارجی شے سے ہے، اہل ادب نے بھی اَسْتَعِیْنُ (میں مدد چاہتا ہوں) اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ مقدر مانے ہیں۔ اَسْتَعِیْنُ کا لفظ بھی مناسب ہے۔ گو اہل ادب کے ذہن میں یہ بات نہ ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر کہیں اَسْتَعِیْنُ بِاللّٰہِ بھی آئے گا تو اس کا مطلب بھی اَسْتَعِیْنُ بِاسْمِ اللّٰہِ ہی ہوگا کیونکہ جو شخص بھی استعانت طلب کرے گا، اللہ

کے نام ہی سے کرے گا۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص اللہ کے نام کے بغیر مدد طلب کرے۔ بہرحال بسم اللہ کے الفاظ مقصود نہیں، نہ اَسْتَعِیْنُ وغیرہ کوئی رسمی چیز ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر چیز میں اللہ کے نام کا ہی ظہور ہے، اسی لیے اس کے نام سے مدد طلب کی جاتی ہے۔

اسی ظہور سے مدد طلب کی جاتی ہے اور اسی ظہور کی مدد سے سب کچھ ہوتا ہے۔ استعانت کے معنی ہیں رجوع الی اللہ۔

گو ہمارے ادیب اس تصور سے بھی نا آشنا ہیں۔ یہ تو تھا اس کا بیان کہ بسم اللہ کا تعلق کس لفظ سے ہے۔ اسم کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ اسم، مسمّٰی کی علامت اور نشانی ہے اور کون سی چیز ہے جو مسمّٰی کی نشانی نہ ہو۔ آپ جس چیز کو بھی دیکھیں گے تو یہی پائیں گے، وہ وجود اللہ جل شانہ کا ظہور اور اس کی نشانی ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ علامت اور نشانی کے بھی مدارج ہیں۔ بعض نام تو ایسے ہیں جو ہر لحاظ سے اس کی نشانی ہیں۔ بعض کا درجہ اس سے کم تر ہے۔ اسی طرح درجہ بہ درجہ سب موجودات ہیں لیکن سب اس کا ظہور اور اس کی نشانیاں ہیں۔ سب اسی کے نام کا جلوہ ہیں۔ گو فرق مراتب اپنی جگہ ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے: نَحْنُ اَسْمَاءُ اللّٰہِ الْحُسْنٰی[1] یعنی ہم اللہ کے اچھے نام ہیں البتہ مقام ظہور میں سب سے ارفع و اعلیٰ نام حضرت نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم ہیں جو نقائص سے پاک ہوکر سیر الی الحق کے بلند ترین مرتبے پر پہنچے۔

وہ ہماری طرح نہیں جو ابھی تک نفسانیت کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں۔

١۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے: نَحْنُ وَاللّٰہِ اَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (اصول کافی)

ہجرت الی اللہ

ہم نے تو ابھی چلنا بھی شروع نہیں کیا جبکہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو نہ صرف یہ کہ اس گڑھے سے نکل گئے بلکہ ہجرت بھی کر گئے۔ ارشاد باری ہے:

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ [1] یعنی جو شخص اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کے لیے اپنے گھر سے نکلا پھر اسے موت نے آلیا تو اللہ اسے اس کا اجر دے گا۔

ایک احتمال یہ ہے کہ یہاں ہجرت سے مراد اپنے نفس سے اللہ کی طرف جانا ہو اور اپنے گھر سے مراد خود آدمی کا اپنا نفس ہو۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس اندھیرے گھر یعنی اپنی نفسیات کے دائرے سے نکل کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کے ارادے سے چلے یہاں تک کہ موت نے انھیں آلیا یعنی وہ خود کچھ نہ رہے بلکہ فنا فی اللہ ہوگئے، ان کا اجر اللہ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا اجر خود اللہ ہے۔ جنت اور اس کی نعمتوں کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ ان کا مطلوب و مقصود صرف اللہ ہے۔ جو شخص نفسانیت کے ظلمت کدہ سے نکل کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف چل پڑا، اس کا اپنا کچھ نہیں رہا۔ اس کے لیے جو کچھ ہے، اللہ کا ہے۔ جو شہود کے اس مرتبے پر پہنچ گیا، اس کا اجر اللہ پر ہے۔ غرض کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ ہجرت کر کے منزل پر پہنچ گئے اور ان کا اجر اللہ ہے جبکہ کچھ دوسرے لوگ ایسے ہیں کہ ہجرت تو انھوں نے بھی کی لیکن وہ فنا کی منزل تک پہنچ نہ سکے۔

اس کے بعد کچھ ہم جیسے ہیں جنھوں نے سرے سے ہجرت ہی نہیں

۱۔ سورۂ نساء: آیت ۱۰۰

کی اور ابھی تک اندھیروں ہی میں ہیں۔ ہم صرف دنیا اور دنیا کی چیزوں میں گم ہیں، بلکہ انانیت اور خود پرستی میں بھی گرفتار ہیں ابھی تک نفسانیت کے اندھیرے کنوئیں میں محبوس ہیں۔ اسی لیے ہمیں اپنے سوا کچھ بجھائی نہیں دیتا۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں صرف اپنے لیے چاہتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہیں، ہم ہی ہیں۔ ہمارے سوا سب ہیچ ہے۔ ہمیں ابھی تک ہجرت کرنے کا خیال تک نہیں آیا۔ ہماری سوچ اسی دنیا تک محدود ہے۔

ستّر سال اس طرف

جو قوتیں خدا کی طرف سے ہمیں ودیعت ہوئی ہیں ہم انھیں رد تو نہیں کرتے لیکن ایسا ہے کہ ہم ان سے یہیں کا کام لیتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے ہم اس سرچشمے اور اس جگہ سے دور ہوتے جاتے ہیں جس کی طرف ہمیں ہجرت کرنی چاہیے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ اچانک بڑے زور سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ صحابہ نے حیران ہوکر پوچھا کہ یہ کیا ہوا؟ روایت کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک پتھر جہنم کے درمیان میں لڑھک رہا تھا۔ اب ستر سال کے بعد اس کنوئیں میں گرا ہے جو جہنم کے دوسرے کنارے پر واقع ہے۔ یہ اسی کے گرنے کی آواز ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ تمثیل ہے اس بد اطوار آدمی کی جو ستر سال کی عمر پا کر مرگیا۔ ہم بھی اسی گڑھے کی طرف جا رہے ہیں۔ میں اسی برس کی عمر میں اُدھر چلا جاؤں گا اور کچھ برسوں میں آپ بھی دوسری طرف چلے جائیں گے۔

ہماری جو حالت ہے اسی وجہ سے ہے اور ہم پر جو کچھ گزرتی ہے، اس کی وجہ یہی حب نفس اور انانیت ہے۔ اسی بات کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اَعْدٰی عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ تمہارا بدترین دشمن تمہارا وہ نفس ہے جو تمہارے اپنے پہلو میں ہے۔ نفس ہر دشمن سے بڑا اور خطرناک دشمن ہے۔ نفس کے بارے میں اس سے سخت اور کوئی تعبیر نہیں ہوسکتی نفس ہی سب بتوں کو جنم دیتا ہے۔ انسان سب سے زیادہ اسی بت کی عبادت کرتا ہے۔ اسے زیادہ تر لگاؤ اسی سے ہے۔ جب تک آدمی اپنے نفس کے اس بت کو پاش پاش نہ کر دے وہ خدا کا نہیں ہوسکتا۔ بت اور خدا ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔ خود پرستی اور خدا پرستی کا ساتھ ممکن نہیں۔ جب تک ہم نفسانیت کے بت خانے اور نفس کے بت سے نجات نہ پالیں، اللہ تعالیٰ کی طرف رخ نہیں کرسکتے۔ گو ہم بظاہر خدا پرست ہوں، لیکن دراصل بت پرست ہیں۔

ہم زبانی خدا کا نام لیتے ہیں لیکن ہمارے دل میں خود اپنا ہی خیال بسا ہوتا ہے۔ ہم نماز پڑھتے ہیں تو اپنے فائدے کے لیے، اگر ہم خدا کے طالب ہیں تو وہ بھی اپنے لیے۔ ہم نماز میں زبان سے تو کہتے ہیں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ لیکن فی الواقع عبادت اپنے نفس کی کرتے ہیں۔ ہماری ساری توجہ ہمارے اپنے ہی اوپر مرکوز رہتی ہے۔ ہر چیز ہمیں اپنے ہی لیے چاہیے۔ سب مصیبتوں اور برائیوں کی جڑ یہی آدمی کی انانیت اور خود پرستی ہے۔

لڑائی جھگڑوں کی وجہ انانیت ہے

دنیا کی سب لڑائیاں آدمی کی انانیت ہی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

مومن آپس میں نہیں لڑتے۔ اگر دو آدمیوں میں لڑائی ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہ مومن نہیں۔ مومنوں میں لڑائی نہیں ہوتی۔

جب آدمی کا ایمان درست نہ ہو اور اسے اپنے فائدے کے سوا کسی بات سے غرض نہ ہو، تو وہ یہی چاہتا ہے کہ ہر چیز پر خود ہی قبضہ کرلے۔ یہیں سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ مسند میں لے لوں، آپ چاہتے ہیں کہ آپ لے لیں۔ اب یہ دونوں باتیں تو ممکن نہیں، لہٰذا جھگڑا پیدا ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ قالین میں لے لوں، آپ چاہتے ہیں کہ آپ لے لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ خیالی کرسی مجھے ملے، آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو ملے۔ جب ایک ہی چیز آپ بھی لینا چاہتے ہیں اور میں بھی لینا چاہتا ہوں تو لامحالہ جھگڑا ہوگا۔ اگر کوئی شخص اس ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور کوئی دوسرا بھی یہی چاہتا ہے تو پھر جنگ ہوگی۔ سب لڑائیاں اور جنگیں خودغرضی کی لڑائیاں ہیں۔ دنیا کی سب جنگیں شخصیتوں اور ان کے مفادات کے ٹکراؤ کے نتیجے میں برپا ہوتی ہیں لیکن چونکہ اولیاء اللہ میں انانیت نہیں ہوتی، اس لیے ان کے مابین جنگ بھی نہیں ہوتی۔ اگر سب اولیاء کسی ایک جگہ جمع بھی ہو جائیں تو وہ کبھی آپس میں نہیں لڑیں گے کیونکہ ان میں کبھی باہمی مخالفت نہیں ہوگی کہ سب اولیاء جو کچھ کرتے ہیں خدا ہی کے لیے کرتے ہیں۔ ان میں خودی ہوتی ہی نہیں کہ باہم کشاکش ہو اور وہ ایک دوسرے کے مزاحم ہوکر جھگڑا کریں۔

ان سب کا سرچشمہ ایک ہے۔ ان کی سمت ایک ہے۔ یہ تو ہم ہیں کہ اندھیرے کنوئیں میں پڑے ہوئے ہیں، جس میں ایسا اندھیرا ہے کہ اس سے بڑھ کر اندھیرا ممکن نہیں۔ یہ اندھیرا انانیت کا ہے۔ جب تک ہم انانیت سے نہیں نکلیں گے اس کنوئیں سے نہیں نکل سکتے۔ ہم اپنی خودغرضی سے

دوسروں کو کچھ نہیں سمجھتے۔ سب کچھ اپنے آپ ہی کو سمجھتے ہیں۔ جس بات میں ہمارا فائدہ ہو، اس کو تو ہم قبول کر لیتے ہیں لیکن جہاں ہمیں اپنا فائدہ نظر نہ آئے، ہم حق بات کو بھی مان کر نہیں دیتے۔ اگر بات ہمارے مطلب کی : تو ہمیں فوراً اس کا یقین آجاتا ہے، لیکن اگر ہمارے خلاف ہو تو کبھی آسانی سے یقین نہیں آتا۔ یہ سب انانیت ہے۔ ہماری، تمہاری اور ساری نوع بشر کی مصیبتوں کا باعث یہی رویہ ہے۔ سب جھگڑا خودغرضی اور خود پرستی کا ہے۔ میں اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہوں آپ اپنا۔ جب تک یہ صورت ہے تو للّٰہیت کہاں؟ یہ تو نفس پرستی ہے۔ پھر اس گڑھے سے نکلنے کی کیا صورت ہے؟ یہ بت خانہ خود انسان کے اندر ہے جس سے نکلنا آسان نہیں۔ اس سے نجات کے لیے ایک غیبی ہاتھ کی ضرورت ہے جو انسان کی دستگیری کرے اور اسے اس گڑھے سے نکالے۔ انبیاء اسی غرض کے لیے آئے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد

تمام انبیاء علیہم السلام جو مبعوث ہوئے ہیں اور سب آسمانی کتابیں جو نازل ہوئی ہیں، وہ سب اسی لیے آئی ہیں کہ آدمی کو اس بت خانے سے نکالیں۔ اس بت کو توڑیں اور لوگوں کو خدا پرست بنائیں۔ سب انبیاء اسی لیے آئے ہیں کہ اس دنیا میں، جو شیطانی دنیا ہے، خدائی نظام قائم کریں۔ یہاں شیطان کی حکومت ہے۔ شیطان ہمارا حکمران ہے اور ہم سب اس کے تابع فرمان ہیں۔ نفسانی خواہشات شیطان کا جلوہ ہیں۔ ہم جو کام کرتے ہیں وہ شیطانی ہوتا ہے کیونکہ سب سے بڑا شیطان خود ہمارا نفس امارہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ہمارا کوئی کام بھی خودغرضی اور خود پرستی سے خالی نہیں ہوتا۔

شیطان ہمارے اوپر مسلط ہے، جو وہ کہتا ہے وہی ہم کرتے ہیں۔ ہم اس کنوئیں سے اسی وقت نکل سکتے ہیں جب ہم اس منزل سے ہجرت کر کے انبیاء اور اولیاء کی تعلیم پر عمل کریں اور خود پرستی کو چھوڑ دیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہمیں وہ کامیابی نصیب ہوگی جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں۔

جو شخص بھی درجۂ کمال تک پہنچنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ ہجرت کرے۔

جہادِ اکبر

جو شخص انانیت کے گڑھے سے نکلنے کا خواہشمند ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس ہجرت کے لیے مجاہدہ کرے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ کچھ صحابہ کسی جہاد سے واپس آئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا تم جہاد اصغر کر کے آئے ہو وَبَقِیَ عَلَیْکُمُ الْجِهَادُ الْاَکْبَرُ ابھی جہاد اکبر تمہارے ذمے باقی ہے۔ یہ جہاد اکبر نفس کے خلاف جہاد ہے۔ دنیا کے باقی سب جہاد اسی جہاد کے تابع ہیں۔ اگر اس جہاد میں ہم کامیاب ہو جائیں تو پھر جو جہاد بھی ہم کریں گے وہ واقعی جہاد ہوگا لیکن اگر اس جہاد میں کامیاب نہ ہوں تو باقی سب جہاد کارِ شیطان ہیں۔ اگر کوئی شخص اس لیے جہاد میں حصہ لیتا ہے کہ اسے کوئی کنیز مل جائے یا روزی کا بندوبست ہو جائے تو اس کا اجر انہی چیزوں کا حصول ہے لیکن جو شخص اللہ کے لیے جہاد کرتا ہے اس کا اجر بھی اللہ کے ذمے ہے۔ کام کی نوعیت میں فرق ہوتا ہے۔ اس کام میں جو ہم کرتے ہیں اور اس کام میں جو اولیاء کرتے ہیں، زمین و آسمان کا فرق ہے کیونکہ دونوں کا مقصد اور منشا جدا ہے۔

حکم الٰہی کی تعمیل میں خلوص دیکھا جاتا ہے

کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلا وجہ فرمایا تھا کہ ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ یعنی امام علی علیہ السلام کی جنگ خندق میں ایک ضرب جن وانس کی عبادت سے افضل ہے؟

بظاہر یہ ضرب کسی کو قتل کرنے کے لیے ایک وار سے زیادہ کچھ نہ تھی لیکن اس کا ایک اور رخ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس وقت اسلام کو کفر کی متحدہ طاقت کا سامنا تھا۔ اگر اس دن مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو اسلام کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ جاتا۔ اس لیے عمرو بن عبدوَد کے مقابلے میں اٹھنے والے ہاتھ کی ایک ضرب کو اتنی اہمیت حاصل ہوئی کہ وہ ضرب ثقلین کی عبادت سے بڑھ گئی۔ یہ حدیث رسولؐ کا ایک پہلو ہے۔ اس حدیث کا ایک دوسرا پہلو وہ خلوص اور للّٰہیت ہے جو اس عمل میں مضمر تھی۔ اُس وقت جب امام علی علیہ السلام دشمن کے سینے پر سوار تھے، اُس نے آپ کے فرق اقدس پر تھوک دیا۔ آپ فوراً اس کے سینے پر سے اتر گئے کہ مبادا آپ کا عمل خلوص اور للّٰہیت کی سطح سے گر جائے اور اس میں ذاتی انتقام کا جذبہ شامل ہو جائے۔

ایسی ضرب کی روح یقیناً سب عبادتوں سے افضل ہے۔ یہی وہ روح ہے جو عبادت کو صحیح معنی میں عبادت بناتی ہے۔ ظاہر میں تو مشرک اور موحد، بت پرست اور وہ جو بتوں کو نہیں پوجتے سب ایک ہی طرح کے کام کرتے ہیں۔ ظواہر کی حد تک کوئی خاص فرق نہیں۔ ابو سفیان بھی نماز پڑھتا تھا اور معاویہ تو امام جماعت بھی تھا اور ان کے ظاہری اعمال ایک ہی طرح کے تھے لیکن وہ چیز جو نماز کو رفعت بخشتی ہے وہ اس کی روح ہے۔ اگر یہ روح موجود ہے تو نماز عبادت الٰہی ہے ورنہ محض دھوکا اور دکھاوا ہے۔ ہمارا یہی حال ہے کہ ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔

ہماری عبادت جنت کے لیے ہے

ہماری سب عبادت سرتا سر اپنے لیے ہے۔ جو زیادہ نیک اور صالح ہیں وہ جنت کے لیے عبادت کرتے ہیں۔ جنت کو درمیان سے نکال دیجئے پھر دیکھئے کہ کون عبادت کرتا ہے۔ علیؑ البتہ رہ جاتے ہیں کیونکہ انھیں عبادت سے عشق تھا اور وہ عبادت کو گلے لگائے ہوئے تھے۔ عَشِقَ الْعِبَادَةَ وَعَانَقَهَا اصولاً جنت کے لیے عبادت کوئی بات نہیں۔ جو شخص نفسانیت سے نکل کر فنا کے مرتبے تک پہنچ گیا اس کے نزدیک جنت کی نعمتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ ان کی پروا بھی نہیں کرتا۔ جس کو اَدْرَكَهُ الْمَوْتُ کا مرتبہ مل گیا، اس کے لیے جنت اور جہنم سب برابر ہیں۔ اَثْنٰى عَلٰى ذَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى وہ خدا کی حمد اس لیے کرتا ہے کہ اس نے اللہ کو عبادت کا مستحق جانا ہے۔ یہ مرتبہ ان کو حاصل ہوتا ہے جو عبادت کے عاشق ہیں۔ وہ معبود کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ عبادت کا اہل ہے۔

اور بھی مراتب ہیں جن کا ہمیں خیال بھی نہیں مگر پہلا قدم یہ ہے کہ آدمی نفسانیت کو چھوڑ کر انانیت کے گڑھے سے نکل جائے۔

اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ قیام کرے، اللہ کے لیے قیام کرے، جاگ جائے اور ہماری طرح سوتا نہ رہے۔ اس وقت ہم گو بظاہر جاگ رہے ہیں مگر دراصل ہم سو رہے ہیں۔ ہمارا جاگنا جانوروں کا سا جاگنا ہے۔ یہ انسانوں کی سی بیداری نہیں۔ ع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اسی لیے کہا گیا ہے:

اَلنَّاسُ نِيَامٌ وَاِذَا مَاتُوا انْتَبَهُوا یعنی "لوگ سو رہے ہیں مرنے پر

Syed Zohaib Haider

ہی جا گیں گے۔"

اس وقت معلوم ہوگا کہ کس خواب غفلت میں تھے اور اب کیا افراتفری مچی ہے۔ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ.[1] یعنی "جہنم کافروں کو گھیرے لے گی۔"

مطلب یہ ہے کہ اس وقت گھیرے ہوئے ہے۔ آدمی پر چونکہ نشہ طاری ہے اس لیے اسے ادراک نہیں ہوتا۔ جب یہ نشہ اتر جائے گا تو وہ دیکھے گا کہ آگ ہی آگ ہے۔ اس راستے پر چلنا تو سب ہی کو ہے۔ اس میں تو چارہ نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم خود ہی بیدار ہو جائیں اور جس صراط مستقیم پر چلنا چاہیے اس پر چلیں اور انبیاء کے زیر تربیت ہو جائیں۔

انبیاء علیہم السلام انسان بنانے کے لیے آئے ہیں

سب انبیاء اس لیے آئے کہ انسانوں کی اصلاح کریں۔ کوئی ایسا نبی نہیں آیا جس کا مقصد انسان کی اصلاح نہ ہو۔ عدل و انصاف قائم کرنے کے معنی بھی انسانوں کی اصلاح ہی ہیں۔ کسی چیز کو عدل اسی وقت کہہ سکتے ہیں جب وہ انسان سے صادر ہو۔ اسی طرح ظلم کا مرتکب بھی انسان ہی ہوتا ہے۔ عدل قائم کرنے کا مطلب ہے ظالم کو عادل میں بدل دینا، مشرک کو مومن بنا دینا۔ انبیاء کا کام ان لوگوں کی کایا پلٹنا ہے کہ اگر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ہاویۂ جہنم میں جا گریں۔ انبیاء بتلاتے ہیں کہ صحیح راستا یہ ہے۔ اس راہ پر چلو۔ افسوس ہمارے حال پر کہ ہم نے ابھی تک صحیح راستا اختیار نہیں کیا۔ ستر برس کی عمر ہوگئی پھر بھی راہ راست پر نہیں آئے۔ ہم نے ابھی تک

۱۔ سورۂ عنکبوت: آیت ۵۴

ہجرت نہیں کی۔ جہاں تھے وہیں ہیں گویا اسی زمین کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ شاید آخر تک یہی حال رہے گا مگر ضرورت اس کی ہے کہ صحیح راستے پر چلیں۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

جوانوں سے خطاب

آپ لوگ، جو جوان ہیں اس راہ کو بہتر طور پر اپنا سکتے ہیں۔ ہمیں چھوڑیے کہ ہماری طاقت ختم ہو چکی ہے۔ آپ اپنے نفس کا تزکیہ ہم سے بہتر کر سکتے ہیں۔ بڈھوں کے مقابلے میں آپ عالم ملکوت سے نزدیک تر ہیں۔ بگاڑ نے آپ میں ابھی تک اس طرح جڑ نہیں پکڑی ہے۔ ابھی بگاڑ کم ہے۔ ابھی اس کی ایسی افزائش نہیں ہوئی جیسی بڈھوں میں ہو چکی ہے لیکن روز بروز بگاڑ بڑھتا جا رہا ہے۔ جتنی دیر کریں گے اتنی ہی مشکل ہو جائے گی۔ بڈھا اگر اپنی اصلاح کرنی چاہے تو بہت مشکل ہے البتہ جوان کی اصلاح جلد ہو جاتی ہے۔

ہزاروں جوانوں کی اصلاح ہو سکتی ہے مگر ایک بڈھے کی اصلاح نہیں ہوتی اس لیے اس کام کو بڑھاپے پر مت چھوڑیے۔ جوانی ہی میں کام شروع کر دیجیے۔ ابھی سے اپنے آپ کو انبیائے کرامؑ کی تعلیم کا تابع بنائیے۔ یہی نقطۂ آغاز ہے۔ یہیں سے سفر کرنا ضروری ہے۔ انبیائے کرامؑ نے راستا دکھا دیا ہے۔ ہم راستے سے ناواقف ہیں جبکہ انبیائے کرامؑ راستے سے واقف ہیں۔ وہ اس راہ کے شناسا ہیں اور جانتے ہیں کہ سلامتی کا راستا کون سا ہے۔ انھوں نے اس راستے کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ اگر آپ سلامتی چاہتے ہیں تو ان کے بتلائے ہوئے راستے پر چلیے۔ اپنے نفس کی طرف آہستہ آہستہ توجہ کم کیجیے۔ یہ کام فوراً نہیں ہوگا لیکن آپ بتدریج نفسانیت کو چھوڑ سکتے ہیں۔

ہماری سب خواہشات ایک دن خاک میں مل جائیں گی۔ ان کی طرف توجہ میں سراسر ہمارا نقصان ہے۔ وہی چیز باقی رہے گی جس کا تعلق خدا سے ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ [1] یعنی "جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔"

انسان کے پاس مَا عِنْدَكُمْ بھی ہے اور مَا عِنْدَ اللّٰهِ بھی۔ جن امور میں اس کی توجہ اپنی ذات کی طرف ہے، وہ سب مَا عِنْدَكُمْ ہے۔ وہ سب فنا ہو جائے گا البتہ جن امور میں توجہ خدا کی طرف ہے وہ اللہ کے نام سے ہمیشہ باقی رہے گا، وہ دائمی ہے اور کبھی ختم نہیں ہوگا۔

نفس پر مکمل فتح تک کوشش

ہماری اور آپ کی اس وقت جو حالت ہے، کوشش کیجیے کہ یہ حالت بدل جائے۔ جن لوگوں نے کفار کے خلاف جہادوں میں کامیابی حاصل کی، انھوں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ ان کے ساتھ کتنی جمعیت ہے۔ وہ [2] بھی تو تھے جنھوں نے کہا تھا: "بخدا! اگر سارا عرب جنگ کے لیے میرے خلاف متحد ہو جائے تب بھی میں میدان چھوڑ کر نہیں بھاگونگا" تو یہ درحقیقت اُن کے عظمت ایمان کی دلیل تھی اور خدا کے ساتھ معاملے میں کسی مخلوق کی رضا شامل نہ تھی اس لیے کہ جو کچھ خدا کے لیے ہو اُس میں ناکامی کا

۱۔ سورۂ نحل: آیت ۹۶

۲۔ یہ امام علی علیہ السلام نے کہا تھا: وَاللّٰهِ لَوْ تَظَاهَرَتِ الْعَرَبُ عَلَىٰ قِتَالِي لَمَا وَلَّيْتُ عَنْهَا۔
(نہج البلاغہ، مکتوب ۴۵)

سوال نہیں پسپائی کا کیا ذکر۔ پھر بھاگ کر جاؤ گے کہاں؟ جو لوگ جہاد اور پیش قدمی کرتے تھے، وہ اپنی اور اپنے مفاد کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے تھے۔ انھوں نے انتہائی حد تک اپنے نفس کے خلاف جہاد کیا تھا۔ جو اس سے بلند درجے پر تھے، ان کا نفس کے خلاف جہاد بھی اسی مناسبت سے بڑھا ہوا تھا۔ جب تک نفس کے خلاف جہاد نہ ہو، کچھ نہیں ہوسکتا۔ آدمی جب تک دنیا سے منہ نہ موڑے، اپنی خواہشات کو نظرانداز نہ کر دے وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ دنیا دراصل نفسانی خواہشات ہی کا نام ہے۔ ہر شخص کی خواہشات ہی اس کی دنیا ہیں۔ اسی دنیا کی مذمت کی گئی ہے، عالم طبیعی کی مذمت نہیں کی گئی۔

دنیا وہی ہے جو آپ کے اندر موجود ہے۔ جب آپ اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو آپ ہی خود دنیا ہوتے ہیں۔ ہر شخص کی دنیا اس کے اندر ہے۔ اسی کی مذمت کی گئی ہے۔

چاند، سورج اور نیچر کی کسی چیز کی مذمت نہیں کی گئی بلکہ ان کی تو تعریف کی گئی ہے۔ یہ تو سب اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اور اس کی قدرت کے مظاہر ہیں۔ جو چیز انسان کو قربِ الٰہی سے محروم رکھتی وہ دنیا ہے اور یہ دنیا خود آدمی کے اپنے ہاتھ میں ہے یعنی یہ دنیا اس کی اپنے نفس کی طرف توجہ ہے۔

خدا کرے ہمیں نفسانیت کے گڑھے سے نکلنے میں کامیابی ہو اور اولیاء اللہ ہی ہیں جو اس گڑھے سے نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور جنھوں نے اس بلا سے نجات پائی ہے وَاذْكُرهُمُ الْمَوْتُ۔

تیسرا درس

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

حق اور خلق

گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ بِسْمِ اللّٰہِ میں اسم کس لفظ سے متعلق ہے۔ اس بارے میں چند احتمالات میں نے عرض کئے تھے۔

ان مسائل میں سے بعض کا سمجھنا اس امر پر موقوف ہے کہ یہ معلوم ہو کہ خدا اور مخلوق کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ ہم عموماً اس تعلق کا ذکر یا تو توتے کی طرح رٹے رٹائے الفاظ میں کر دیتے ہیں یا کبھی کبھی دلائل بھی دیدیتے ہیں۔ اس سے اونچا درجہ کچھ دوسرے ہی لوگوں کا حق ہے۔ بہر حال موجودات کا حق تعالیٰ سے تعلق اس نوعیت کا نہیں ہے جس طرح کا تعلق ایک موجود کا دوسرے موجود سے ہوتا ہے مثلاً باپ کا بیٹے سے یا بیٹے کا باپ سے۔ باپ بیٹے کا تعلق تو وہ تعلق ہے جو دو ایسے موجودوں کے درمیان ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک کا وجود مستقل ہو اور ساتھ ہی ان میں کچھ تعلق بھی ہو۔ اس سے برتر تعلق کی مثال سورج اور اس کی کرنوں کی ہے۔ یہاں بھی سورج اور اس کی کرنیں دو مختلف چیزیں ہیں اور ایک حد تک ان کا اپنا الگ الگ وجود ہے۔ ایک اور طرح کے تعلق کی مثال انسان کی ذات اور اس کے ذہنی و جسمانی قویٰ کی ہے مثلاً قوتِ باصرہ یا قوتِ سامعہ، لیکن ان میں بھی

انسان کی ذات سے ایک طرح کی مغایرت پائی جاتی ہے اور یہ قوتیں اور انسان کی ذات شے واحد نہیں ہیں۔ ان تمام مثالوں کے برخلاف موجودات کا تعلق حق تعالیٰ سے جو سرچشمۂ وجود ہے بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔ جن تعلقات کا ہم نے اوپر ذکر کیا، ان میں سے کسی پر بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا۔
خالق اور مخلوق کے تعلق کو کتاب و سنت میں کئی جگہ تجلی سے تعبیر کیا گیا ہے جیسے فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا [1] یا مثلاً دعائے سمات میں آیا ہے:

وَبِنُوْرِ وَجْہِکَ الَّذِیْ تَجَلَّیْتَ بِہٖ لِلْجَبَلِ فَجَعَلْتَہٗ دَکًّا۔

ایک جگہ قرآن مجید میں ہے:

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا [2] یعنی ''اللہ موت کے وقت لوگوں کی روحیں قبض کر لیتا ہے۔'' حالانکہ تَوَفِّی یعنی روح قبض کرنا ملک الموت کا کام ہے۔ اگر کوئی آدمی کسی کو قتل کر دے تو اُس کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے فلاں شخص کو مار ڈالا۔

اسی طرح اگر وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ کا تجزیہ کیا جائے تو یوں کہا جاسکے گا کہ

مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ
رَمَیْتَ وَمَا رَمَیْتَ

اس صورت میں درحقیقت تجلی مقصود ہے کیونکہ یہ سب ایک تجلی ہے ایک نور ہے۔ اگر ہم اس مفہوم پر دلیل کی روشنی میں یا بغیر دلیل کے بھی غور کریں تو ان آیات سے متعلق کچھ مسائل ذہن میں آتے ہیں۔

۱۔ سورۂ اعراف: آیت ۱۴۳
۲۔ سورۂ زمر: آیت ۴۲

الحمد کے معنی کے متعلق پہلا احتمال ہم نے یہ بیان کیا تھا کہ اس میں الف لام استغراق کا ہو اور حمد سے مراد ہو تمام تعریفیں یعنی اس لفظ میں کثرت کا مفہوم ہو اور اسی طرح اسم کے لفظ میں بھی کثرت کا مفہوم ہو۔ اس لحاظ سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے ایک احتمالی معنی یہ ہوئے کہ جو حمد بھی ہوتی ہے وہ حق تعالیٰ ہی کی ہوتی ہے کیونکہ جو تعریف بھی کی جاتی ہے وہ اُس کے کسی نہ کسی جلوے کی جاتی ہے اور ہر جلوے میں اسی کا ظہور ہے۔ سورج کا ظہور اس کی شعاعوں میں ہے یا انسان کی ذات کا جو ظہور اس کی قوت باصرہ اور سامعہ میں ہے، حق تعالیٰ کا ظہور تمام موجودات ومخلوقات میں اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اس لیے جو تعریف بھی ہوتی ہے وہ حق تعالیٰ ہی کے مظاہر کی ہوتی ہے اور چونکہ تمام موجودات حق تعالیٰ کی نشانیاں ہیں اس لیے یہ سب اس کے اسماء اور نام ہیں۔ دوسرا احتمال ہم نے یہ بیان کیا تھا کہ یہ مفہوم پہلے مفہوم کے برعکس ہوگا اور معنی یہ ہوں گے کہ کسی تعریف کرنے والے کی تعریف بھی اللہ کی تعریف نہیں ہوتی۔ گو اس صورت میں بھی تمام مظاہر اسی کا ظہور ہیں اور حمد بھی انھیں مظاہر کی ہوتی ہے لیکن ہماری حمد نہ علی الاطلاق ہوتی ہے اور نہ اس ذات مطلق کی ہوسکتی ہے۔

لیکن چونکہ تمام کثرتیں اسی وجود مطلق کی وحدت میں گم اور جذب ہوجاتی ہیں اور ان کا مستقل وجود باقی نہیں رہتا اس لیے اس صورت میں بھی ایک لحاظ سے حمد اسی وجود مطلق کی ہوگی۔ فرق صرف کثرت اور وحدت کے اعتبار کا ہے۔ اگر کثرت پر نظر کی جائے تو ہر حمد اسی کی حمد ہوتی ہے۔ اسی طرح لفظ اسم میں بھی کثرت کا اعتبار ہوگا۔ اس لحاظ سے ہر موجود اسم الٰہی ہوگا اور

ایک اسم دوسرے اسم سے مختلف ہوگا۔

اس احتمال کی رو سے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے معنی اس سے مختلف ہوں گے جو دوسرے احتمال کی رو سے ہوتے ہیں۔ اسم کے مفہوم میں کثرت پر نظر ہوگی، اللہ اس اسم کا وصف ہوگا جس میں مقام کثرت اور مقام تفصیل ملحوظ ہے۔ اللہ اسم اعظم پر حق تعالیٰ کی تجلی ہے۔

موجودات میں تجلی

موجودات میں اسم اعظم کی تجلی ہے۔ اللہ کا نام رحمان، رحمانیت کی تجلی ہے مقام فعل میں۔ اسی طرح رحیم، رحیمیت کی تجلی ہے مقام فعل میں۔ یہی صورت رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ وغیرہ کی ہے۔ دوسرے احتمال کی رو سے حمد، حمد مطلق ہے بغیر کسی قید کے۔ اس احتمال کی رو سے اللہ، رحمان اور رحیم وغیرہ کا تصور بھی قدرے مختلف ہے۔ پہلے احتمال کی رو سے اسم سے مراد سب موجودات تھے۔

ہر موجود اپنے ہر عمل کے لحاظ سے ایک الگ اسم تھا اور عمل کے بدل جانے سے ایک مختلف اسم بن جاتا تھا مگر دوسرے احتمال کی رو سے حمد مطلق ہے۔ مطلق حمد اللہ، رحمان اور رحیم کے ناموں کے ساتھ۔

مطلق حمد حق تعالیٰ سے مخصوص ہے یعنی وہی اپنی حمد کرتا ہے۔ مطلق حمد کرتا ہے کسی ایسے نام کے ساتھ جو مقام ذات کے ظہور کا نام ہے یعنی مقام ذات میں اپنے ناموں کے ساتھ حمد کرتا ہے۔ اللہ مقام ذات میں اسم جامع ہے نہ کہ مقام ظہور میں۔ اللہ کا ہر نام مقام ذات میں اس کا جلوہ ہے۔ رحمان نام ہے رحمانیت کا مقام ذات میں۔ رحیم نام ہے رحیمیت کا مقام

ذات میں۔ رب وغیرہ کی بھی یہی صورت ہے۔ فلسفے میں یعنی اعلیٰ فلسفے میں جو عام اور معروف فلسفے سے مختلف ہے ان مفاہیم و معانی کے دلائل بھی موجود ہیں مگر اولیاء کی بات اور ہے۔ انھوں نے سلوک کی منازل طے کرکے ان مسائل کا ادراک اور مشاہدہ کیا ہے۔

مشاہدات انبیاء علیہم السلام

اولیاء اپنے مشاہدات لوگوں سے بیان نہیں کرسکتے۔ قرآن شریف بھی جو نازل ہوا ہے، وہ ہم تک متنزل حالت (اعلیٰ و ارفع حقائق کو گھٹا کر سادہ اور آسان انداز میں پیش کرنا) میں پہنچا ہے تاکہ ان لوگوں کو مخاطب کرسکے جو ابھی تک نفسانیت کی قید میں ہیں اور گمراہی کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اور ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ آپ لوگوں کے سامنے حقائق کو صاف صاف بیان نہیں کرسکتے تھے بلکہ حقائق و معارف متنزل حالت میں پیش فرماتے تھے۔ معانی کے لحاظ سے قرآن مجید کے مختلف مدارج ہیں۔ قرآن مجید سات یا ستر بطون[1] (پوشیدہ معانی) پر نازل ہوا ہے۔ ان بطون سے مسلسل تنزل کرکے قرآن مجید اس درجے تک پہنچا ہے کہ وہ ہمارے لیے قابل فہم ہو اور اس کے مضامین ہماری محدود عقل میں آسکیں۔

اللہ تعالیٰ نے خود اپنا تعارف کراتے ہوئے اونٹ کی مثال بیان فرمائی ہے: اَفَلَا یَنظُرُونَ اِلَی الاِبِلِ کَیفَ خُلِقَت[2] یعنی "کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسا (عجیب) پیدا کیا گیا ہے؟"

۱۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار ج ۸۹، ص ۷۳   ۲۔ سورۂ غاشیہ: آیت ۱۷

یہ ہماری کس قدر بدقسمتی ہے کہ ادنیٰ درجے کی مخلوقات جیسے سورج، آسمان، زمین اور خود انسان کے بارے میں بیان کرتے ہوئے انبیائے کرام علیہم السلام یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی زبان میں گرہ ہے اور وہ صاف الفاظ میں حقیقت کا اظہار نہیں کرسکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہا تھا:
رَبِّ اشرَح لِی صَدرِی ○ وَیَسِّر لِی اَمرِی ○ وَاحلُل عُقدَۃً مِّن لِّسَانِی ○[1]
یعنی "اے میرے پروردگار (اس کام کے لیے) میرا سینہ کھول دے اور میرا کام آسان کردے اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔"

یہ گرہیں دیگر انبیاء کی زبان میں بھی تھیں اور ان کے دل میں بھی تھیں جن کی وجہ سے وہ حقائق کا اس طرح اظہار نہیں کرسکتے تھے جس طرح وہ حقائق ان تک پہنچتے تھے۔ اسی لیے وہ مثالوں کی مدد سے بات کو ایک حد تک ہمیں سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ جب اونٹ کی مثال دے کر اللہ تعالیٰ کے وجود کو سمجھایا جائے تو باآسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارا اپنا درجہ کیا ہے۔ ہمارا اپنا درجہ بھی جانوروں کا سا ہے اور جو علم و معرفت ہمیں اس طرح حاصل ہوتا ہے ظاہر ہے وہ بھی حد درجہ ناقص ہی ہے۔

انبیاء کے سلسلے میں ایک جگہ قرآن مجید میں آیا ہے: فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوسٰی صَعِقًا یعنی "جب اُن کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو وہ ریزہ ریزہ ہوگیا اور موسیٰ بے ہوش ہوکر گر پڑے۔"

اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصی تربیت کی اور وہ سلوک کی منازل سے گزرے تو انھوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی: رَبِّ اَرِنِی اَنظُر اِلَیکَ[2]

۱۔ سورۂ طٰہٰ: آیت ۲۵ تا ۲۷

۲۔ سورۂ اعراف: آیت ۱۴۳

یعنی "پروردگار! میں تجھے دیکھوں۔"

ظاہر ہے کہ ایک بزرگ نبی خود خدا کو ظاہری آنکھ سے دیکھنے کی تو درخواست نہیں کر سکتے اس لیے رویت کا مطلب وہی ہوگا جو رائی یعنی دیکھنے والے اور مرئی جسے دیکھا جائے دونوں کے حسب حال ہو اور اللہ کی ایسی رویت حاصل نہیں ہو سکتی۔ بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے کہا: رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ تو جواب آیا لَنْ تَرَانِیْ یعنی "تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔" شاید اس کا یہ مطلب تھا کہ جب تک تم موسیٰ ہو یعنی تمہاری ہستی فنا نہیں ہو جاتی، تم مجھے نہیں دیکھ سکتے لیکن حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مایوس نہیں کیا، اس لیے مزید فرمایا: اُنْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ پہاڑ کی طرف دیکھو۔ اس پہاڑ کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس سے کوہ طور مراد ہے؟ کیا جو تجلی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نہیں ہو سکتی تھی، اُس پہاڑ پر ہو سکتی تھی؟ کیا اُس وقت اگر کچھ لوگ کوہ طور پر موجود ہوتے تو وہ بھی اس تجلی کو دیکھتے؟ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ اور اُنْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ میں ایک وعدہ ہے۔ ایک ملاقات کا ذکر ہے۔ فرمایا: تم نہیں دیکھ سکتے وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوْفَ تَرَانِیْ[1] یعنی "لیکن پہاڑ کی طرف دیکھو۔ اگر یہ اپنی جگہ قائم رہا تو تم مجھ کو دیکھ سکو گے۔" احتمال یہ ہے کہ اپنی جگہ قائم رہنے سے مراد وہیں ٹوٹ پھوٹ جانا ہو اور پہاڑ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نفس میں جو کچھ انانیت باقی رہ گئی تھی وہ ہو۔ تجلی کے نتیجے میں پہاڑ ڈھے گیا، یعنی وہ انانیت کی حالت بالکل ختم ہوئی وَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا یعنی موسیٰ علیہ السلام فنائیت کے درجے تک پہنچ گئے۔

۱۔ سورۂ اعراف: آیت ۱۴۳

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ ہمارے لیے تو محض ایک قصہ ہے لیکن انبیاء کے لیے ایک مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ چونکہ ہم ابھی تک انانیت کے ظلمت کدہ میں اسیر ہیں، اس لیے یہ تجربہ ہمارے لیے قصہ کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ پہاڑ اور طور کی بات ہم جیسوں کے لیے کی گئی ہے۔

تجلی کے معنی

ہم جیسوں کے خیال میں تجلی ایک نور تھا جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر دیکھا۔ دوسروں نے بھی شاید دیکھا ہو۔ کیا خوب! گویا وہ بھی کوئی ایسا نور تھا جسے سب محسوس کر سکتے اور دیکھ سکتے تھے۔ جبرئیل امینؑ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے لیکن وہاں موجود دوسرے لوگ بھی اسے سن سکتے تھے؟ ہم اصلیت کی پرچھائیں سے بھی غافل ہیں۔ ہمارا علم دور سے سنی سنائی باتوں تک محدود ہے۔

انبیاء کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے کوئی خواب دیکھا ہو یا کوئی مشاہدہ کیا ہو لیکن نہ تو وہ خود اپنی بات کہہ سکتا ہو اور نہ دوسروں میں اس کی بات سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ یہی حال انبیاء کا ہے کہ نہ وہ کہہ سکتے ہیں، نہ ہم سمجھ سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے لیکن ہمارے لیے نہیں کیونکہ ہم صرف وہی باتیں سمجھ سکتے ہیں جو ہمارے سمجھنے کی ہیں۔ قرآن میں سب کچھ ہے، شرعی اور ظاہری احکام بھی اور وہ قصے بھی جن کے مغز تک تو ہماری رسائی نہیں البتہ ہم ان کا ظاہری مطلب سمجھ لیتے ہیں۔ کچھ باتیں ایسی ہیں کہ ان سے ایک حد تک تو سب استفادہ کر سکتے ہیں لیکن اِنَّمَا یَعْرِفُ الْقُرْآنَ مَنْ خُوْطِبَ بِہٖ (قرآن کو وہی سمجھتا ہے جو اس کا مخاطب ہے) صحیح استفادہ حضرت رسول کریم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کرسکتے تھے۔ دوسرے اس سے محروم ہیں البتہ وہ نفوس قدسیہ جنھیں آپ نے تعلیم دی اور وہ اولیاء جو آپ کی تعلیم سے بہرہ مند ہوئے وہ ضرور سمجھتے ہیں۔

قرآن روح الامینؑ کے توسط سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل ہوا تھا جیسا کہ خود قرآن میں ہے کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلٰى قَلْبِكَ[1] یعنی "اس کو روح الامینؑ لے کر نازل ہوئے اور آپ کے دل پر اسے القا کیا۔" نیز ہر بار اس کا نزول پہلے سے متنزل حالت میں ہوا یہاں تک کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود نزول کے اس مقام تنزل پر ہیں جو ایک ایسا مقام ہے کہ خود 'اُس' سے لیتے ہیں۔ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِىْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ یعنی "ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا۔" ہر شب قدر میں وہی جلوہ نازل ہوتا ہے لیکن مقام تنزل میں اونچے مقام پر روح الامینؑ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن عالم بالا سے تنزل کرکے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب پر نازل ہوا۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا کیونکہ تنزل کے بغیر قرآن امکان پذیر ہی نہ تھا لہٰذا ضروری ہوا کہ تنزل کرتا ہوا اور مختلف بطون سے گزرتا ہوا اس مقام تک پہنچ جائے کہ اس کی حقیقتیں الفاظ کے سانچے میں ڈھل جائیں۔

قرآن کی ماہیت

اصل میں قرآن الفاظ کے مجموعے کا نام نہیں ہے، نہ کوئی ایسی چیز

۱۔ سورۂ شعراء: آیت ۱۹۳

ہے جس کو دیکھا یا سنا جاسکے یا الفاظ میں ادا کیا جاسکے۔ نہ وہ کسی کیفیت کا نام ہے لیکن اسے ایک آسان شکل دیدی گئی ہے تاکہ ہم جیسے اندھے اور بہرے بھی اس سے استفادہ کرسکیں۔ جو لوگ قرآن سے واقعی مستفید ہوئے تھے، ان کی تربیت ایک بالکل مختلف انداز پر ہوئی تھی۔ ان کا کتاب اللہ سے فیض حاصل کرنے کا طریقہ بھی کچھ اور ہی تھا۔ جس سرچشمے سے قرآن نازل ہوا ہے، اس سرچشمے کی طرف ان کی توجہ کی نوعیت بھی اس صورتحال سے مختلف تھی جو ہمارے یہاں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جلوہ عالم غیب سے ظاہر ہوتا ہے اور درجہ بدرجہ متنزل ہوکر عالم طبیعی تک پہنچتا ہے۔ جس طرح عالم طبیعی یا عالم جسمانی وظاہری میں اور عالم غیب کے بے شمار مراتب اور مدارج میں فرق ہے، اسی طرح ہم جیسوں کے ادراک میں جو اُن سے بالاتر ہیں اور پھر اُن کے ادراک میں جو اور بھی بالاتر ہیں، فرق ہے۔ ادراک کا بلندترین مرتبہ اولیاء، خاصان خدا اور انبیاءؑ کو حاصل ہے۔ وہ اس مرتبے پر ہیں کہ ان کے لیے وہ جلوہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تھا اور جس کا ذکر قرآن میں ہے: تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ اور دعائے سمات میں ہے کہ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِىْ تَجَلَّيْتَ بِهٖ لِلْجَبَلِ اسی سلسلے میں جب درخت پر تجلی ہوئی تو حضرت موسیٰؑ کو آواز آئی: اِنِّىْٓ اَنَا اللّٰهُ[1] یہ سب صحیح ہے۔ ان میں سے ہر چیز اپنی جگہ مکمل ہے۔ رہا یہ سوال کہ اگر ہم قرآن کو سیکھنا چاہیں تو کیا کریں، تو اس معنی میں یہ مسائل سیکھنے سکھانے کے نہیں ہیں۔

قرآن کی تفسیر

جب ہم قرآن اور اس کی تفسیر پر نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں تو ہمارے

۱۔ سورۂ طٰہٰ: آیت ۱۴

سامنے یہی مشہور اور متداول تفاسیر ہوتی ہیں جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔

ان میں سے بعض تفاسیر میں ان مضامین کا بھی کچھ ذکر ہے لیکن اس کی صورت اندھے بہروں کے پڑھنے پڑھانے کی ہے۔ قرآن میں سب مسائل موجود ہیں لیکن اسی کے لیے جو اُس کو سمجھ سکے۔ اِنَّمَا یَعْرِفُ الْقُرْآنَ مَنْ خُوْطِبَ بِہٖ (قرآن کو وہی جانتا ہے جو اس کا مخاطب ہے)۔ اس مرتبے کی طرف قرآن کی ان آیات میں اشارہ ہے: نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ اور اِنَّا اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا جو قرآن کے مخاطب اولین ہیں کوئی اور قرآن کی حقیقت کا مشاہدہ نہیں کرسکتا۔

یہاں سوال عقلی ادراک کا نہیں۔ دلیل و برہان کا یہاں کچھ دخل نہیں۔ یہ تو مشاہدے کا سوال ہے اور مشاہدہ بھی غیبی مشاہدہ۔ یہ مشاہدہ نہ آنکھ سے ہوتا ہے نہ ذہن سے اور نہ ہی عقل سے بلکہ یہ قلب سے ہوتا ہے اور قلب بھی نبی کا جو قلب عالم ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کی حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ قرآن کے مخاطب کی حیثیت سے اسے جانتے پہچانتے ہیں مگر وہ بھی صرف مثالوں کے پیرائے میں اور الفاظ کے پردے میں ہی بیان کرسکتے ہیں۔ جو آدمی اندھا ہو ہم اسے کیسے سمجھا سکتے ہیں کہ سورج کی روشنی کیا ہے؟ ہم اس کو کس زبان سے سمجھائیں گے؟ ہم الفاظ کہاں سے لائیں گے؟ صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ روشنی سے اجالا ہو جاتا ہے۔ وہ جس نے نور دیکھا ہے، اسے جس نے نور نہیں دیکھا کیا بتلائے؟ جس کی زبان میں گرہ ہے وہ اس سے کیا کہے جس کے کانوں میں گرہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی زبان میں ایسی ہی گرہ تھی اور اس لیے تھی کہ سننے والوں میں ان کی بات سننے اور سمجھنے کی صلاحیت مفقود تھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی الجھن

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس گروہ کی وجہ سے سب سے زیادہ الجھن اور پریشانی کا سامنا تھا۔ آپ کو پریشانی یہ تھی کہ جو قرآن آپ کے قلب پر وحی الٰہی کے ذریعے نازل ہوا تھا۔ آپ اسے کس کو سمجھائیں؟

شاید بہت سی باتیں سوائے اس شخص کے جو ولایت تامہ کے درجے پر فائز تھا اور کسی کے سامنے بیان نہیں کی جاسکتی تھیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے کہ آپ نے فرمایا تھا مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ مِثْلَ مَا اُوْذِیْتُ (کسی نبی نے ایسی تکلیف نہیں اٹھائی جیسی کہ میں نے اٹھائی ہے) تو ممکن ہے اس کے ایک معنی یہ بھی ہوں کہ جو کچھ آپ دوسروں تک پہنچانا چاہتے تھے، وہ نہیں پہنچا سکتے۔ اگر کسی شخص تک کوئی بات پہنچے اور وہ اسے دوسروں تک پہنچانا چاہے مگر نہ پہنچا سکے تو ظاہر ہے کہ اسے اس کا شدت سے احساس ہوگا کہ اسے دوسروں سے بہت زیادہ معلوم ہے مگر خواہش کے باوجود وہ ان تک اپنی بات نہیں پہنچا سکتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی باپ چاہتا ہے کہ اس کا بچہ سورج کو دیکھے لیکن بچہ نابینا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے اس کا کتنا احساس ہوگا؟ باپ دل و جان سے چاہتا ہے کہ بچے کو سمجھائے لیکن آخر کیا کہے کہ بچہ سورج اور اس کی روشنی کو سمجھ لے؟ مفہوم کو جس عنوان سے بھی بیان کرے مفہوم واضح نہیں ہوسکتا۔ وہ بچے کے نابینا ہونے اور الفاظ کی نارسائی کے سبب مجبور ہے۔

اَلْعِلْمُ ھُوَ الْحِجَابُ الْاَکْبَرُ یعنی سب سے بڑی رکاوٹ یہی علم ہے جو انسان کو عقلی مسائل اور کلیات میں الجھا کر معرفت کی راہ پر چلنے سے باز رکھتا ہے۔ اولیاء کے لیے تو علم سب سے بڑا حجاب ہے۔ علم جتنا زیادہ ہوگا، اتنی ہی بڑی رکاوٹ ثابت ہوگا۔ انسان چونکہ خود پرست ہے اس لیے وہ اپنے

محدود علم پر پھولا نہیں سماتا اور سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی ہے۔ ہاں اگر اللہ توفیق دے اور آدمی جلد اپنی خام خیالی سے باز آجائے تو اور بات ہے۔

علم میں اجارہ داری کا رجحان

جس شخص نے جو علم پڑھ اور سیکھ لیا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہی علم سب کچھ ہے اور سب کمالات اسی پر موقوف ہیں۔ فقیہ سمجھتا ہے کہ فقہ کے سوا دنیا میں اور کوئی علم ہے ہی نہیں۔ عارف خیال کرتا ہے کہ جو کچھ ہے عرفان ہے۔ فلسفی کا خیال ہے کہ فلسفے کے ماسوا سب بیکار ہے۔ انجینئر سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہے انجینئری ہی ہے۔ آج کل علم اس کو سمجھا جاتا ہے کہ جس کا ثبوت مشاہدے اور تجربے وغیرہ سے ہو۔ باقی کو علم سمجھا ہی نہیں جاتا۔ غرض علم ہم سب کے لیے ایک بڑا حجاب ہے۔ اگرچہ اور بھی بہت سے حجابات ہیں لیکن علم حجاب اکبر ہے۔

جس علم کو چراغ راہ ہونا چاہیے تھا وہی سدّ راہ ہے۔ جس علم سے ہدایت کی توقع تھی وہی ہدایت کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ سب رسمی علوم کا یہی حال ہے۔ علوم انسان کو وہ کچھ نہیں بننے دیتے جو اسے بننا چاہیے۔ وہ آدمی میں خود پرستی کی قبیح خصلت پیدا کرتے ہیں۔ غیر تربیت یافتہ ذہن پر علم کا یہی اثر ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو پیچھے کی طرف لے جاتا ہے۔ جتنا علم کا انبار بڑھتا جاتا ہے، اس کے نقصانات بھی اتنے ہی زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ سنگلاخ بنجر زمین میں بیج ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بنجر زمین اور وہ غیر تربیت یافتہ دل و دماغ جس پر پردہ پڑا ہوا ہو اور جو خدا کے نام سے گھبراتا ہو برابر ہیں۔ بعض لوگ فلسفیانہ مسائل سے ایسے ڈر کر بھاگتے ہیں

جیسے یہ مسائل کوئی سانپ ہیں، حالانکہ فلسفہ علوم رسمیہ میں شامل ہے اور فلسفی بھی عرفان سے اسی طرح بھاگتے ہیں۔ عارفوں کا بھی یہی حال ہے بلکہ سب رسمی علوم کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ

سراسر قیل است و قال

علوم اللہ کی یاد میں رکاوٹ بنتے ہیں

مجھے نہیں معلوم کہ ہمیں کیا بننا چاہیے مگر کم از کم کچھ ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری تربیت ایسی ہو کہ رسمی علوم خدا کی یاد میں رکاوٹ نہ بنیں۔ یہ خود اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے۔ علم میں مشغولی کی وجہ سے یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم خدا اور اس کی یاد سے غافل ہو جائیں۔ یہ نہ ہو کہ علم میں مشغولی کے سبب ہم میں ایسا غرور پیدا ہو جائے جو ہمیں سرچشمۂ کمال سے دور کر دے۔ اس طرح کا غرور دانشوروں میں عام ہے خواہ ان کا تعلق طبی علوم سے ہو خواہ شرعی یا عقلی علوم سے۔ اگر قلب کا تزکیہ نہ ہو تو ایسا غرور پیدا ہونا قدرتی بات ہے جو انسان کو قطعاً خدا سے دور رکھتا ہے۔

جب آدمی مطالعے میں مشغول ہوتا ہے اس وقت تو وہ مطالعے میں مستغرق ہوتا ہے لیکن جب وہ نماز میں مشغول ہوتا ہے تو وہ نماز میں مستغرق نہیں ہوتا۔ یہ کیا بات ہے؟ اللہ بخشے میرا ایک دوست تھا۔ وہ جب کوئی بات بھول جاتا تھا تو کہتا تھا، مجھے یہ بات یاد نہیں آرہی۔ ذرا نماز کے لیے کھڑا ہو جاؤں تو پھر یاد آجائے گی۔ گویا جب آدمی نماز شروع کرتا ہے تو وہ بالکل نماز میں نہیں ہوتا۔ اس کی توجہ خدا کی طرف نہیں ہوتی۔ اس کا دل کہیں اور ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی علمی مسئلے ہی کو حل کرنے کی فکر میں ہو۔ وہی علم

جو مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ تھا، انسان کو مقصد تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ علم شرعی ہو، علم تفسیر ہو یا علم توحید یہ سب ایک غیر تربیت یافتہ اور غیر تزکیہ شدہ انسان کے لیے رکاوٹ بن جاتے ہیں اور مقصد تک پہنچنے میں مانع ہوتے ہیں۔ علوم شرعیہ ہوں یا مسائل شرعیہ یہ سب عمل کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ خود عمل بھی ذریعہ ہی ہے، مقصد نہیں۔ اصل مقصد یہ ہے کہ نفس بیدار ہو جائے اور ظلمانی حجابات سے نکل کر نورانی حجابات تک پہنچ جائے جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِنَّ سَبْعِیْنَ اَلْفَ حِجَابٍ مِّنْ نُّوْرٍ نور کے ستر ہزار حجاب ہیں۔ ظلمت کے بھی ستر ہزار ہی حجاب ہیں اور جو نور کے حجاب ہیں، وہ بھی آخر حجاب ہی ہیں۔ ہم ابھی ظلمانی حجابوں سے بھی باہر نہیں نکلے۔ نورانی حجاب تو دور کی بات ہے۔ ہم تو ابھی تک ظلمانی حجابات ہی میں پڑے کلبلا رہے ہیں۔ اللہ ہی جانے ہمارا کیا انجام ہوگا؟

علوم نے بھی ہمارے نفوس پر کچھ برا ہی اثر ڈالا ہے۔ ان میں چاہے شرعی علوم ہوں یا وہ عقلی علوم جن کو یہ بیچارے اندھیروں میں بھٹکے ہوئے ذہنیات کا نام دیتے ہیں۔

ذہنیات اور عینیات

یہ لوگ عقلی علوم کو ذہنیات کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اُن کا وجود ذہن میں تو ہے خارج میں نہیں۔ بہر حال سب علوم مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ جو علم اصل مقصد تک پہنچنے میں رکاوٹ ہے، وہ علم ہی نہیں ہے۔ جو علم آدمی کو اس مقصد سے دور رکھے جس کے لیے انبیاءؑ آئے ہیں، وہ حجاب ہے، ظلمت ہے۔ انبیاءؑ اس لیے آئے ہیں کہ وہ لوگوں کو اس دنیا کی ظلمتوں سے نکال کر

نور کے واحد سرچشمے تک پہنچا دیں نہ کہ اس طرف ظلمت ہو اور اس طرف نور بلکہ مطلق نور ہو۔ انبیاءؑ کا ہدف یہ ہے کہ انسان نور مطلق میں فنا ہو جائے۔ قطرہ دریا میں مل کر اپنا وجود کھو دے۔ یاد رہے کہ یہ مثال بھی صورتحال پر پوری طرح منطبق نہیں ہے۔

تمام انبیاءؑ اسی غرض سے آئے ہیں۔ تمام علوم اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اصل وجود اسی نور کا ہے۔ ہم محض عدم ہیں۔ ہماری اصل وہاں سے ہے۔ عینیت یعنی وجود نور سے ہے کہ سب انبیاءؑ اسی لیے آئے ہیں کہ ہمیں ظلمتوں سے نکال کر نور واحد تک پہنچا دیں۔ ظلمانی اور نورانی حجابات سے نکال کر نور مطلق سے ملا دیں۔

کبھی کبھی علم توحید یا علم کلام بھی حجاب بن جاتا ہے۔ گو اس علم میں حق تعالیٰ کے وجود پر دلائل قائم کیے جاتے ہیں لیکن یہ دلائل بھی بعض اوقات خدا سے دور کر دیتے ہیں۔ انبیاءؑ کا یہ طریقہ نہیں تھا۔ اولیاء اور انبیاءؑ اس طرح دلائل نہیں دیتے تھے۔ وہ دلائل سے واقف تھے لیکن واجب الوجود کو ثابت کرنے کے لیے ان کا طریقہ برہانی نہیں تھا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام (دعائے عرفہ میں) خدا سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مَتٰی غِبْتَ ؟ پروردگار تو غائب ہی کب تھا؟ (کہ تیرے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت ہو)۔ اندھی ہو جائے وہ آنکھ جو یہ نہ دیکھے کہ تو موجود ہے اور تو اسے دیکھ رہا ہے۔

واقعی ایسی آنکھ اندھی ہے۔

خدا کے لیے قیام

قیام کا پہلا درجہ یہ ہے: قُلْ اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ[1] یعنی "(اے رسولؐ) کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کے لیے قیام کرو۔"

اصحاب سیر نے اسے پہلی منزل قرار دیا ہے لیکن شاید یہ تمہید ہی ہو اور منزل نہ ہو۔ منازل السائرین میں بھی اسے پہلی منزل قرار دیا گیا ہے لیکن ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ایک محبوب شخصیت کے توسط سے فرماتا ہے کہ میں تمھیں فقط ایک نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ تم اللہ کے لیے قیام کرو۔ یہیں سے سب باتیں اور سب مسائل شروع ہوتے ہیں کہ آدمی جاگ جائے اور اللہ کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ جو لوگ نیند کے ماتے ہیں، سو رہے ہیں، بیہوش ہیں، ان سے کہا گیا ہے کہ بس ایک کام کرو اور وہ یہ کہ خدا کے لیے قیام کرو اور یہ قیام صرف خدا کے لیے ہو۔ یہی وہ ایک نصیحت ہے جس پر ہم نے ابھی تک کان نہیں دھرا اور خدا کے لیے چلنا شروع نہیں کیا۔ ہم چلتے ہیں لیکن اپنے لیے۔ جو لوگ بہت اچھے اور نیک ہیں، وہ بھی اپنے ہی لیے ہیں۔ کچھ اولیاء البتہ ہیں جن کا طریقہ مختلف ہے۔ یہ نصیحت ہمارے لیے ہے جو سو رہے ہیں۔ وہ تو عالم بالا میں پہنچ چکے۔ ہمیں بھی وہیں لے جایا جائے گا۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم یہیں رہیں گے۔ جو موکل فرشتے ہمارے قویٰ پر مسلط ہیں وہ ہمیں اس طرف لے جا رہے ہیں۔ یہ قویٰ خود ہمیں ہماری زندگی کی ابتدا ہی سے اس طرف دھکیل رہے ہیں۔ ایک اور جگہ لے جا رہے ہیں۔ ہم جائیں گے لیکن کیا ان ہی ظلمتوں اور حجابوں کے ساتھ چلے جائیں گے؟

۱۔ سورۂ سبا: آیت ۴۶

دنیا کی محبت فتنوں کی جڑ ہے

دنیا کی محبت سب چیزوں کا سرچشمہ ہونے کے ساتھ ساتھ سب غلطیوں کی جڑ بھی ہے حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ مشہور مقولہ ہے۔ محبت دنیا کی وجہ سے بعض اوقات آدمی کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ موحد ہونے کے باوجود اگر اسے یہ خیال ہو جائے کہ خدا نے فلاں چیز اس سے لے لی ہے تو اس کے دل میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ جب آدمی کا آخری وقت ہوتا ہے اور وہ اس دنیا سے جانے والا ہوتا ہے تو شیاطین جو نہیں چاہتے کہ آدمی کا ایمان پر خاتمہ ہو، اس کی محبوب چیزیں اس کے سامنے لاتے ہیں مثلاً اگر کوئی طالب علم ہے اور کتابوں سے محبت کرتا ہے تو اس کے سامنے اس کی پسندیدہ کتابیں لا کر کہتے ہیں کہ اپنے عقیدے سے پھر جاؤ ورنہ ہم ان کتابوں کو آگ لگا دیں گے۔ یہی صورت اس شخص کی ہوتی ہے جسے اپنے بچے سے محبت ہو یا اور کسی چیز سے دلچسپی ہو۔

یہ مت سمجھئے کہ دنیادار وہ لوگ ہیں جن کے پاس مثلاً دولت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کے پاس بہت دولت ہو لیکن وہ پھر بھی دنیادار نہ ہو یا مثلاً ایک طالب علم کے پاس فقط ایک کتاب ہو اور اس کتاب سے دلی لگاؤ کے سبب وہ دنیادار ہو۔ دنیاداری کا معیار وہ لگاؤ اور تعلق ہے جو انسان کو دنیا کی چیزوں سے ہو۔ اس لگاؤ کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ آخری وقت میں جب انسان یہ دیکھے کہ وہ اپنی پسندیدہ چیزوں سے جدا ہو رہا ہے تو وہ خدا سے دشمنی پر اتر آئے اور دشمن خدا بن کر اس دنیا سے رخصت ہو اس لیے ضروری ہے کہ لگاؤ کو کم کیا جائے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جب ہم سب کو ایک نہ ایک دن

یہاں سے جانا ہے تو دنیا سے لگاؤ ہونے نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

فرض کیجئے کہ یہ آپ کی کتاب ہے۔ اب اس کتاب سے آپ کو دل لگاؤ ہو یا نہ ہو یہ کتاب آپ ہی کے پاس رہے گی۔ آپ اس سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ آپ اس گھر سے دل لگائیں یا نہ لگائیں یہ گھر آپ ہی کا ہے۔ آپ اسے استعمال کر سکتے ہیں، اس لیے لگاؤ کم کیجئے، جہاں تک ہو سکے لگاؤ ختم ہی کر دیجئے۔ اسی لگاؤ کے سبب مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ دنیا سے لگاؤ آدمی کو اپنی ذات سے محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ حب نفس، حب دنیا اور حب جاہ ہی ہے جو انسان کو ہلاکت تک پہنچاتی ہے۔ کرسی کی محبت، محراب و منبر کی محبت یہ سب دنیا ہے۔ دنیا سے لگاؤ ہے۔ یہ سب حجاب ہیں کہ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ہم بیٹھ کر یہ کہنے لگ جائیں کہ جن کے پاس یہ ہے اور وہ ہے وہ لوگ دنیادار ہیں بلکہ یہ دیکھیں کہ خود ہمارے پاس جو کچھ ہے ہمیں اس سے کتنا لگاؤ ہے۔ ہمارا یہی لگاؤ اور دلچسپی ہے جس کی وجہ سے ہم دوسروں پر اعتراض کرتے ہیں۔

حب نفس

اگر حب نفس اور خود غرضی نہ ہو تو آدمی دوسروں کی عیب جوئی نہیں کرتا۔ یہ جو ہم میں سے بعض لوگ دوسروں پر نکتہ چینی کرتے ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ ہم حب نفس کی وجہ سے اپنے آپ کو مہذب، درست اور مکمل سمجھتے ہیں اور دوسروں کو عیب دار اور ناقص تصور کرتے ہیں اسی لیے ان میں کیڑے نکالتے ہیں۔ ایک شعر ہے، میں شعر تو نہیں پڑھوں گا کیونکہ اس پر ایک طرح سے اعتراض ہو سکتا ہے مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تو وہی کچھ ہوں جو تو

کہتا ہے مگر کیا تو بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ تو اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔

ہم حوزہ (جامعہ) میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم یہاں خدا کے لیے آئے ہیں۔ ہم علم حاصل کرتے ہیں، ہم شریعت کا درس لیتے ہیں۔ ہم جُندُ اللّٰہ یعنی خدا کا لشکر اور اُس کی فوج ہیں۔ ہم نے اپنا نام تو جند اللہ رکھ لیا ہے لیکن کیا ہم وہی ہیں جو ظاہر کرتے ہیں؟ کم از کم ہمارا ظاہر و باطن تو یکساں ہو۔

کیا نفاق اس کے سوا کسی اور چیز کا نام ہے؟ نفاق صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دین دار ظاہر کرے اور حقیقت میں ابوسفیان کی طرح دین دار نہ ہو۔ یہ بھی نفاق ہے کہ آدمی یہ کہے کہ میں ایسا ہوں اور ویسا ہوں اور دراصل وہ کچھ نہ ہو۔ ایسے لوگ منافق ہیں۔ کچھ منافقت کے اس درجے پر ہیں اور کچھ اُس درجے پر۔ آخری بات یہ ہے کہ جب آدمی دنیا سے جائے تو اس کے متعلق یہ نہ کہا جائے کہ یہ لوگ آخرت کی طرف بلاتے ہیں مگر دنیا کی طرف نہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت بھی وہاں کے لیے تھی مگر وہ دنیا میں بھی عدل و انصاف قائم کرتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گو خاص الخاص اللہ والے تھے مگر فرماتے تھے: لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِيْ لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ مَرَّةً یعنی ''اپنے دل میں کدورت آجانے کے سبب میں دن میں ستر دفعہ استغفار کرتا ہوں۔'' ایسے شخص کے لیے جو اپنے محبوب کے سامنے دائم الحضور رہنا چاہتا ہو غیروں سے ملنا جلنا کدورت کا باعث ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک آدمی آپ کے پاس آتا ہے۔ بہت اچھا اور صحیح آدمی ہے۔ وہ آپ سے مسئلہ پوچھنا چاہتا ہے لیکن یہی بات آپ کو اپنے محبوب کے حضور سے باز رکھتی ہے لیکن یہی لئے آپ کو، اس مرتبے سے جس کے آپ خواہاں ہیں، باز رکھتے ہیں۔

اگرچہ مسئلہ بتانا یا ہدایت کرنا آپ کے نزدیک محبوب کے مظاہر میں سے ہے لیکن آپ جو یہ چاہتے ہیں کہ اس مرتبۂ دائم الحضوری میں ہوں اس سے یہ آپ کو باز رکھتا ہے۔

''اپنے دل میں کدورت آنے کے سبب میں اللہ سے ہر روز ستر بار استغفار کرتا ہوں'' اس طرح کے الفاظ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہیں مگر اس قسم کی باتوں میں پڑنا ہمارے لیے حجاب ہے اور اس حجاب سے باہر نکلنا ضروری ہے۔ کم از کم جیسا ہم اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں، ویسے ضرور بنیں۔ اگر ہمارے ماتھے پر سجدے کا نشان ہے تو پھر ہم نماز میں دکھاوا نہ کریں۔ اگر ہم تقدس کا جامہ پہنے ہوئے ہیں تو سود نہ کھائیں، کسی کو دھوکا نہ دیں وغیرہ وغیرہ۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ روحانی علوم آدمی کو نکما کر دیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ جس شخص نے لوگوں کو ان روحانی علوم کی تعلیم دی اور جس کی مانند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی حقائق سے واقف نہیں تھا اس نے جس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی تاریخ کے مطابق وہ اسی دن اپنا بیلچہ اٹھا کر کام پر چلا گیا۔ ان باتوں میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے۔

جو صاحبان لوگوں کو بخیال خویش دعا، ذکر اور اس طرح کی چیزوں سے روکتے ہیں تاکہ لوگ دنیوی کاموں میں مشغول رہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ انھیں معلوم نہیں کہ یہ دعا وغیرہ ہی ہیں جو آدمی کو انسان بناتی اور اسے جینا سکھاتی ہیں تاکہ دنیا اس سے اس کے شایان شان سلوک کرے۔ انبیاء و رسل علیہم السلام جو اہل ذکر و فکر بھی تھے اور جو نماز اور دعا میں بھی مشغول رہتے تھے انھوں نے ہی دنیا میں عدل قائم کیا ہے۔

ظالموں کے خلاف قیام بھی انھوں نے ہی کیا ہے۔ یہی کام حضرت امام حسینؑ نے بھی کیا۔ آپ ان کی دعائے یوم العرفہ دیکھیے کہ کیا ہے!

یہی دعائیں ان باتوں کا سرچشمہ ہیں۔ یہی دعائیں انسان کو خدا کی طرف توجہ دلاتی ہیں اور مبدائے غیبی کی طرف ملتفت کرتی ہیں۔ اگر انسان دعاؤں کو صحیح طریقے سے پڑھے تو خدا کی طرف توجہ کی برکت سے اس کا اپنی ذات سے لگاؤ کم ہو جاتا ہے لیکن اس سے اس کی کارگزاری پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا بلکہ اس کی سرگرمی بڑھ جاتی ہے لیکن اس کی یہ سرگرمی اپنے لیے نہیں ہوتی۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ بندگان خدا کی خدمت کے لیے بھی اسے مستعد ہونا چاہیے۔

یہ لوگ دعاؤں کی کتابوں پر جو نکتہ چینی کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیچارے ناواقف ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ یہ دعاؤں کی کتابیں کیسے انسان کی تعمیر کرتی ہیں۔ یہ دعائیں ہمارے ائمہ طاہرینؑ سے مروی ہیں جیسے مناجات شعبانیہ، دعائے کمیل، دعائے عرفہ، دعائے سمات وغیرہ۔ یہ دعائیں کس طرح کے انسان بناتی ہیں؟ جو دعائے شعبانیہ پڑھتا ہے وہ تلوار بھی اٹھاتا ہے۔

روایات کے مطابق دعائے شعبانیہ سب ائمہ پڑھتے تھے۔ میں نے باقی دعاؤں کے متعلق یہ نہیں دیکھا کہ کہیں یہ آیا ہو کہ ان کو سب ائمہ پڑھتے تھے۔ وہی جو دعائے شعبانیہ پڑھتے تھے، تلوار بھی چلاتے تھے اور کفار سے جنگ بھی کرتے تھے۔ یہ دعائیں آدمی کو تاریکی سے نکالتی ہیں اور جب کوئی شخص تاریکی سے باہر آ گیا تو وہ انسان بن گیا۔ پھر وہ ہر کام خدا کے لیے کرتا ہے۔ تلوار چلاتا ہے تو خدا کے لیے، قتال کرتا ہے تو خدا کے لیے۔ قیام کرتا

ہے تو خدا کے لیے۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ دعائیں آدمی کو نکما اور بیکار کر دیتی ہیں۔ جو حضرات ایسی باتیں کرتے ہیں، ان کے نزدیک جو کچھ ہے یہی دنیا ہے۔ یہاں سے آگے کی ہر بات ان لوگوں کی نظر میں محض خیالی باتیں ہیں لیکن ایک وقت آئے گا جب وہ دیکھیں گے کہ وہ جن باتوں کو خیالی کہتے تھے حقیقی وجود ان ہی کا ہے اور دراصل خیالی باتیں وہ ہیں جن کو وہ حقیقی سمجھتے تھے کیونکہ یہی دعائیں، یہی خطبے، یہی نہج البلاغہ اور یہی مفاتیح الجنان (یعنی یہ دعاؤں کی کتابیں) شخصیت کی تعمیر میں آدمی کی مدد کرتی ہیں۔

ہر عمل خدا کے لیے ہونا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
(غالبؔ)

پس جب کوئی آدمی واقعی انسان بن جاتا ہے تو وہ ان مسائل پر خود بخود عمل کرنے لگتا ہے۔ وہ کھیتی کرتا ہے لیکن اس کی کھیتی خدا کے لیے ہوتی ہے، وہ جنگ بھی کرتا ہے لیکن اس کی جنگ کفار اور ظالموں کے خلاف ہوتی ہے۔ یہی لوگ اصحاب توحید اور دعاخواں ہوتے ہیں۔ جو لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیرالمومنین علیہ السلام کے ہمرکاب تھے، وہ عموماً عبادت بھی خوب کرتے تھے۔

خود حضرت امیرالمومنین علیہ السلام عین معرکہ کارزار میں نماز پڑھتے تھے۔ ایک طرف جدال و قتال کا ہنگامہ برپا ہوتا تھا دوسری طرف وہ نماز پڑھ رہے ہوتے تھے۔ لڑتے بھی تھے اور نماز بھی پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ جب

معرکہ کارزار گرم تھا کسی نے آپ سے ایک مسئلہ پوچھا۔ آپ کھڑے ہو گئے اور توحید پر تقریر کی۔ کسی نے کہا: اس وقت بھی تقریر؟ آپ نے فرمایا:

اسی کے لیے تو ہم جنگ کرتے ہیں۔ حسب روایت آپ نے کہا کہ ہماری جنگ دنیا کے لیے نہیں ہے۔ ہم معاویہ سے اس لیے جنگ نہیں کرتے کہ شام پر قبضہ کرلیں۔ شام کیا چیز ہے؟

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیرالمومنین علیہ السلام شام اور عراق فتح کرنے کے خواہاں نہیں تھے۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ وہاں کے لوگوں کو انسان بنائیں، ان کو مستکبرین سے نجات دلائیں۔ یہی لوگ یہ دعائیں پڑھتے تھے۔ یہ دعائے کمیل حضرت امیرالمومنین علیہ السلام ہی سے منقول ہے۔ جناب کمیل ہی کو دیکھ لیجیے وہ بھی تلوار چلاتے تھے۔

قلوب پر دعا کا اثر

اس لیے کہ لوگ دعا نہ کریں اور دعائیں اور دعاؤں کی کتابیں نہ پڑھیں ایک دن ان خبیث لوگوں نے جو کسروی جیسے شیطانوں کے پیروکار تھے عرفان اور ادعیہ کی کتابیں اکٹھی کرکے انھیں آگ لگا دی۔ وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ دعا کیا ہے اور انسان کے دل پر دعا کا کیا اثر ہوتا ہے۔ انھیں نہیں معلوم کہ سب خیرات و برکات دعا خوانوں کی وجہ سے ہے۔ یہی لوگ ہیں جو کسی نہ کسی طرح دعائیں پڑھتے اور ذکر خدا کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ توتے کی طرح پڑھتے ہیں پھر بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے اور یہ بہرحال ان لوگوں سے بہتر ہیں جو بالکل نہیں پڑھتے۔

ایک نمازی، گو اس کی نماز کتنے ہی گھٹیا درجے کی ہو، بے نمازی

سے بہر حال بہتر ہے ، وہ زیادہ مہذب ہے۔ وہ چوری نہیں کرتا۔ مجرموں کی فہرست پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ ان میں کتنے دینی علوم کے طلبہ ہیں اور کتنے دوسرے لوگ ؟ کتنے ملاؤں نے چوری ، شراب نوشی اور دوسرے جرائم کا ارتکاب کیا ہے ؟ البتہ اسمگلروں کے گروہ میں کچھ ملا اور صوفی صورت لوگ ہوتے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ بدمعاش نہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ کچھ اور کرتے ہیں ، انھوں نے فقط اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے ایسی صورت بنا رکھی ہے۔ جو لوگ ایسے ہیں کہ دعائیں پڑھتے ہیں اور اسلام کے ظاہری احکام پر عمل کرتے ہیں ان میں ایسے لوگ جن پر کوئی فرد جرم عائد کی گئی ہو یا تو ہیں ہی نہیں یا بہت کم ہیں۔

ان ہی لوگوں سے اس دنیا کا نظام برقرار ہے۔ دعا کو ختم نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات غلط ہوگی کہ ہمارے نوجوانوں کی توجہ دعاؤں سے یہ کہہ کر ہٹا دی جائے کہ ان کے بجائے قرآن کی تلاوت کو رواج دیا جانا چاہیے۔ جو چیز قرآن کی راہ ہموار کرتی ہے اس کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ یہ شیطانی وسوسہ ہے کہ قرآن پڑھنا چاہیے اور دعا اور حدیث کو چھوڑ دینا چاہیے۔

دعا اور حدیث کے بغیر قرآن

اگر دعا اور حدیث کو چھوڑ کر قرآن کو لانے کی کوشش کی جائے تو یہ لوگ قرآن کو بھی نہیں لا سکیں گے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں دعائیں نہیں قرآن چاہیے وہ کبھی قرآن کو رواج نہیں دے سکتے۔ یہ سب شیطانی وسوسے اور دھوکا دہی کی باتیں ہیں۔ جوانوں کو دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ اہل حدیث ، اہل ذکر اور اہل دعا تھے انھوں نے اس معاشرے کی زیادہ خدمت کی ہے یا

انھوں نے جن میں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی اور جو یہ کہتے تھے کہ محض قرآن کافی ہے ؟ کس نے زیادہ خدمت کی ہے ؟ یہ سب خیرات و برات جو آپ دیکھ رہے ہیں ان ہی مومنین کے کارنامے ہیں۔ یہ سب اوقاف جو خیرات کے لیے یا غریبوں کی دستگیری کے لیے ہیں یہ ان ہی نماز پڑھنے والوں اور قرآن پڑھنے والوں کے عطیات ہیں ، دوسروں کے نہیں۔

سابقہ دور کے متمول امراء میں سے جو نمازی تھے انھوں نے ہی مدرسے قائم کیے اور ہسپتال وغیرہ بنوائے۔ یہ طریقہ ختم نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کو رواج دینا چاہیے۔ لوگوں کو اس کی ترغیب دینے کی ضرورت ہے کہ وہ ایسے نیک کاموں کی طرف توجہ باقی رکھیں۔ اس سے قطع نظر کہ یہ دعائیں روحانی کمال حاصل کرنے میں مدد و معاون ہوتی ہیں ، یہ ملک کے انتظام میں بھی مدد دیتی ہیں۔ ملک کے نظم و نسق کے لیے بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی جا کر چوروں کو پکڑے اور کبھی اس کی کہ خود چوری نہ کرے۔ جو لوگ مسجدوں میں جاتے اور دعائیں کرتے ہیں وہ قانون شکنی نہیں کرتے اور امن عامہ میں خلل نہیں ڈالتے۔ یہ خود معاشرے کی ایک بڑی خدمت ہے۔ معاشرہ افراد سے بنتا ہے۔ فرض کیجیے اگر معاشرے میں آدھے افراد بھی ایسے ہوں جو دعا ، ذکر وغیرہ میں مشغولی کے سبب جرائم سے اجتناب کریں تو کتنی اچھی بات ہے۔

مثلاً ایک کاریگر ہے ، وہ اپنا کام کرتا ہے ، روزی کماتا ہے اور کوئی گناہ نہیں کرتا مگر جو لوگ قتل و غارتگری کرتے ہیں ، انھیں روحانی امور سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اگر روحانیت سے دلچسپی ہوتی تو وہ ایسے کام نہ کرتے۔

معاشرے کی تربیت ان ہی دعاؤں وغیرہ سے ہوتی ہے۔ یہ دعائیں خدا کی اور اس کے رسولؐ کی بتلائی ہوئی ہیں۔ اسی کو ایک جگہ اس طرح بیان کیا

گیا ہے: قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ [1] یعنی "(اے رسولؐ) آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہاری دعا نہ ہو تو میرے پروردگار کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہوگی۔" اگر آپ قرآن پڑھتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن خود دعا کی تعریف کرتا ہے۔ لوگوں کو دعا کی ترغیب دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر تم دعا نہ کرتے ہوتے تو ہمیں تمہاری کوئی پروا نہ ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ قرآن کو بھی نہیں مانتے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہمیں دعا نہیں چاہیے اسے قرآن سے بھی دلچسپی نہیں یعنی وہ قرآن کو مانتا ہی نہیں۔ قرآن میں تو اللہ کا ارشاد ہے: اُدْعُونِیٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ [2] یعنی "لوگوں کو چاہیے کہ مجھے پکاریں اور مجھ سے دعا مانگیں۔"

اللہ تعالیٰ ہمیں اہل دعا، اہل ذکر اور اہل قرآن میں شامل فرمائے!

۱۔ سورۂ فرقان: آیت ۷۷

۲۔ سورۂ مومن: آیت ۶۰

چوتھا درس

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

باءِ بسم اللہ

ہم نے اب تک بسم اللہ کے بارے میں جو گفتگو کی ہے اس سے ایک بات اور معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ بسم اللہ کی 'باء' سببیت کے معنی میں نہیں جیسا کہ اہل ادب کہتے ہیں۔ دراصل حق تعالیٰ کی فاعلیت میں سببیت و مسببیت اور علیت و معلولیت ہے ہی نہیں۔ خالق و مخلوق کے درمیان رشتے کی بہترین تعبیر وہی ہے جو قرآن میں ہے۔ قرآن میں اسے کہیں تجلی سے تعبیر کیا گیا ہے تَجَلّٰى رَبُّهٗ کہیں ظہور کہا گیا ہے اور کہیں حق تعالیٰ کے متعلق کہا گیا ہے: هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ [1] یہ معاملہ سببیت و مسببیت سے مختلف ہے کیونکہ سببیت و مسببیت میں ایک تمایل کا رجحان پایا جاتا ہے جو ذات باری تعالیٰ کے مناسب نہیں ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ اور موجودات کا جو رشتہ ہے اس کے لیے یہ تعبیر صحیح نہیں۔

اس لیے ہم یا تو سببیت کے معنی کو اتنی وسعت دیں کہ اس میں تجلی اور ظہور بھی شامل ہو جائیں یا پھر یہ کہیں کہ یہاں 'باء' سببیت کی نہیں ہے اور بسم اللہ کذا کے معنی ہیں۔ بظھورہ کذا یا تجلّی کذا بالحمد بِسْمِ اللّٰه

۱۔ سورۂ حدید: آیت ۳

یا کچھ اور اسی طرح کی تقدیر عبارت مراد لی جائے۔

اسی طرح بِسْمِ اللّٰہِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے یہ معنی نہیں کہ اسم سبب ہے اور حمد مسبب۔ بہر حال مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ مسببیت اور علیت کے الفاظ قرآن وسنت میں کہیں آئے ہوں۔ یہ ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے جو فلاسفہ کی زبان پر ہے۔ اس معنی میں قرآن وسنت میں علیت اور سببیت کے الفاظ نہیں آئے بلکہ خلق، ظہور اور تجلی وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

ایک پہلو اور بھی ہے اور اس کے بارے میں بھی ایک روایت ہے۔ یہ باء کے نیچے نقطے کا معاملہ ہے۔ ایک روایت ہے، معلوم نہیں کہ یہ روایت کہیں آئی ہے یا نہیں۔ شواہد تو یہی ہیں کہ یہ روایت کہیں نہیں آئی۔ بہرحال ایک روایت ہے کہ حضرت امیرالمومنینؑ نے فرمایا اَنَا نُقْطَةُ تَحْتَ الْبَاءِ کہ 'باء' کے نیچے کا نقطہ میں ہوں۔ اگر یہ روایت واقعی کہیں آئی ہو تو اس کی تاویل یوں کی جاسکتی ہے کہ باء کے معنی ہیں ظہور مطلق۔ نقطے سے مراد ہے اس کا تعین جو عبارت ہے مقام ولایت سے۔ اگر اس قسم کی بات کہیں آئی ہے تو ممکن ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کا مقصد یہ ہو کہ مقام ولایت (ولایت کلی کے معنی میں) ظہور مطلق کا تعین اول ہے جس طرح نقطہ 'باء' کا تعین کرتا ہے۔

اسم تجلی مطلق ہے

اسم تجلی مطلق ہے۔ اس کا اولین تعین ولایت احمدی وعلوی وغیرہ سے ہوتا ہے۔ اگر یہ بات کہیں حدیث میں نہ بھی آئی ہو جب بھی مسئلہ اسی طرح ہے۔ تجلی مطلق کے تعین اول سے مراد وجود کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے اور وجود کا اعلیٰ ترین مرتبہ ولایت مطلقہ ہے۔ صورت یہ ہے کہ اسم الٰہی کبھی مقام ذات کا

عنوان ہوتا ہے مقام ذات کا جامع اسم، اللہ ہے اور کبھی صفات کے ظہور کا جیسے رحمانیت، رحیمیت وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب اسماء، اسم اعظم اللہ کی تجلیات ہیں۔ ان میں سے بعض اسماء مقام ذات کے نام ہیں، بعض اسماء تجلیات فعلی ہیں۔ پہلی قسم کے اسماء کو مقام احدیت، دوسری قسم کے اسماء کو مقام واحدیت اور تیسری قسم کے اسماء کو مقام مشیت کہا جاتا ہے۔ یہ سب اصطلاحات ہیں۔

سورۂ حشر کے آخر کی تین آیات میں اسماء کی شاید یہی تقسیم ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيمُ ○ یعنی "وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا۔ وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔"

هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○ یعنی "وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بادشاہ، ہر عیب سے پاک، سلامتی و امن دینے والا، نگہبان، غالب زبردست بڑائی والا۔ خدا اُن لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔"

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ ○ یعنی "وہی خدا (سب مخلوقات کا) خالق، موجد اور صورتیں بنانے والا ہے۔"

احتمال یہ ہے کہ ان تین آیات میں اسماء کے انہی تین مقامات کی طرف اشارہ ہے۔ پہلی آیت میں وہ اسماء ہیں جو مقام ذات کے مناسب ہیں۔ دوسری آیت میں وہ اسماء ہیں جو تجلی اسمی سے مناسبت رکھتے ہیں اور تیسری آیت وہ اسماء ہیں جو تجلی فعلی سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اب جلوۂ الٰہی کے تین درجے ہوئے:

ایک جلوہٴ ذات برائے ذات۔

دوسرا جلوہ در مقام اسماء۔

تیسرا جلوہ در مقام ظہور۔

شاید هُوَ الْاَوَّلُ وَالْآخِرُ سے ہر دوسری ہستی کی نفی ہوتی ہے کیونکہ اول بھی وہی ہے اور آخر بھی وہی ہے هُوَ الْاَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہور جو کچھ ہے وہی ہے، یہ نہیں کہ ظہور اس سے ہے۔ وہی اول ہے، وہی آخر ہے۔ وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے۔

جلوہ، جلوے والے سے جدا نہیں

جلوے کے مراتب ہیں لیکن یہ نہیں ہے کہ جلوہ، جلوے والے سے الگ کوئی چیز ہو۔ گو اس کا تصور مشکل ہے لیکن تصور کے بعد اس کی تصدیق آسان ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ”اللہ“ اس تجلی کا نام ہو جو مقام صفات میں ہے۔ اگر ایسا ہو تو بسم اللہ میں اسم سے مراد تجلی کے مجموعی جلوے کا ظہور ہوگا۔ جن دو احتمالوں کا ہم نے پہلے ذکر کیا تھا ان کے انطباق میں اس صورت میں بھی کوئی دشواری نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات سے جدا نہیں ہیں۔ ان مسائل و مباحث کے ضمن میں ایک ضروری بات یہ ہے کہ کبھی تو ہم کسی واقعے کو اس نقطہٴ نظر سے دیکھتے ہیں کہ ہمارا ادراک کیا کہتا ہے اور کبھی اس لحاظ سے کہ عقل کیا کہتی ہے اور کبھی اس لحاظ سے کہ دل کا تاثر کیا ہے اور کبھی ہم اصل واقعے کو مقام شہود میں دیکھتے ہیں۔ سب روحانی امور کا یہی حال ہے۔

ہمارے ادراک کی آخری حد یا تو ادراک عقلی ہے ادراک برہانی یا

نیم برہانی۔ ہم واقعے کا ادراک اپنی عقل کے مطابق کرتے ہیں۔ ان مسائل میں ایک درجہ یہ ہے کہ ہم بس اتنا سمجھ لیں کہ اللہ کی ذات مقدس اور اس کا جلوہ ہے۔ ہم جس طرح بھی ادراک کریں، آخر میں بات یہیں تک رہتی ہے۔

اصل حقیقت صرف ذات مقدس اور اس کا جلوہ ہے

اصل مسئلہ صرف ذات مقدس اور اس کے جلوے کا ہے۔ رہی یہ بات کہ مقام ذات، مقام صفات یا مقام فعل میں اس کی تجلی کی نوعیت کیا ہے تو جو آیات ہم نے نقل کی ہیں، ان سے اتنا ہی پتا چلتا ہے کہ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ مسئلے کی حقیقت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کے مقابل کوئی دوسرا وجود نہیں۔ وجود مطلق کے مقابل کسی وجود کا ہونا ہے بھی بے معنی بات۔ ہم کبھی کبھی اپنے ادراک کے مطابق کچھ حساب لگاتے ہیں کہ ہمارا اپنا ادراک کیا ہے، ہماری عقل کیا کہتی ہے اور کیا ہمارا ادراک عقلی ہمارے دل میں اس حد تک جاگزیں ہوگیا ہے یا نہیں کہ اس کا نام ایمان ہو جائے اور آیا ہم نے اپنا روحانی سفر شروع کر دیا ہے یا نہیں کہ اس کا نام عرفان یا معرفت ہو جائے۔ اسی طرح اور جو کچھ انسان کے بس میں ہو۔ بہرحال یہ معاملہ واقعات کی نسبت ہمارے ادراک کا ہے۔

اصل حقیقت جو کچھ ہے، وہی ہے

غور کرنے سے حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا اور کچھ نہیں جو کچھ ہے، وہی ہے۔ اس کا جلوہ بھی خود وہی ہے۔ ہم کوئی ایسی مثال نہیں دے سکتے جو اصل حقیقت پر منطبق ہو جائے۔ ظل اور ذی ظل (سایہ اور جس کا سایہ ہو) کی مثال بھی ناقص ہے۔

ذات اور جلوے کی مثال دریا اور موج کی مثال ہے

شاید سب مثالوں سے نزدیک ترین مثال دریا اور موج دریا کی ہے۔ موج، دریا سے الگ نہیں لیکن موج تو دریا ہے مگر دریا موج نہیں ہے۔ جب دریا متموج ہوتا ہے تو اس میں موجیں اٹھتی ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں دریا اور اس کی موجیں الگ الگ محسوس ہوتی ہیں لیکن موج ایک عارضی چیز ہے کہ وہ پھر دریا میں مل جاتی ہے۔ دراصل دریا کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔ دریا کی موج بھی دریا ہی ہے۔ یہ دنیا بھی ایک موج کی طرح ہے۔

یہ مثال بھی اسی قسم کی ہے جس کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے:

خاک بر فرق من و تمثیلم

دراصل کوئی مثال ہے ہی نہیں۔ ہم اپنے ادراک کے مطابق ان مسائل پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ ایک تو ان مسائل کے کلی تصورات ہیں جیسے اسم ذات، اسم صفات، اسم افعال اور فلاں فلاں مقام۔ یہ سب مفہوم ہیں جن کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ادراک کے بعد ان مفہوموں کو دلیل اور برہان سے ثابت کیا جائے کہ حقیقت یہی ہے۔ اس کا ثبوت دیا جائے کہ حق تعالیٰ کی ذات اور اس کا جلوہ الگ الگ نہیں ہیں۔

جب اس امر کے دلائل دیئے جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ خالص وجود ہے، وجود مطلق ہے اور وجود مطلق بلاتعین ہے۔ اس کے وجود کے ساتھ کوئی قید نہیں لگائی جاسکتی اور نہ کسی طرح اس کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر وجود کسی طرح محدود ہو یا اس میں کوئی نقص ہو تو وہ وجود مطلق نہیں ہوسکتا۔ وجود مطلق وہی ہے جس کا تعین نہ ہو اور جس میں کوئی نقص اور کمی نہ ہو۔ جب وجود مطلق ہر طرح کے نقص اور تعین سے مبرا ہوگا تو لامحالہ

تمام وجود ہوگا۔ "تمام" بھی ناقص ہے یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ اس میں کسی حیثیت سے کوئی کمی ہو۔ وجود مطلق کے تمام اوصاف بھی مطلق ہیں، متعین نہیں۔ نہ اس کی رحمانیت ایک متعین رحمانیت ہے، نہ اس کی رحیمیت ایک متعین رحیمیت ہے اور نہ اس کی الوہیت ایک متعین الوہیت ہے۔

کسی بھی کمال کے فقدان کے معنی تعین ہیں

جب وہ نور مطلق اور وجود بلاتعین ہے تو یہ بھی لازمی ہے کہ وہ سب کمالات کا جامع اور مجتمع جمیع الصفات ہو کیونکہ کسی بھی کمال کے فقدان کا نتیجہ تعین ہے۔ اگر مقام ذات ربوبیت میں ایک نقطے یا شوشے کی بھی کمی یا عیب ہو تو اس پر مطلق کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اس صورت میں حق تعالیٰ کی ذات ناقص ہو جائے گی اور جب ناقص ہو جائے گی تو ممکن ہوگی نہ کہ واجب۔ واجب کے لیے کمال مطلق اور جمال مطلق ہونا ضروری ہے۔

چنانچہ جب ہم اپنی ناقص عقل کے مطابق اللہ کے متعلق غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ نام ہے اس ذات مطلق کا جس کے سب جلوے ہیں، جو جامع جمیع اسماء وصفات اور جامع جمیع کمالات ہے۔ وہ کمال مطلق اور کمال بے تعین ہے اور چونکہ کمال مطلق اور کمال بے تعین ہے اس لیے یہ نہیں ہوسکتا کہ اس میں کسی چیز کی کمی ہو ورنہ تو وہ ممکن ہو جائے گا، واجب نہیں رہے گا۔ ممکن اسی کو کہتے ہیں جو ناقص ہو۔ ممکن خواہ کسی بھی مرتبۂ کمال کو کیوں نہ پہنچ جائے، جب مطلق نہیں تو ممکن ہی رہے گا۔ وجود مطلق مستجمع جمیع الصفات اور واجد جمیع الکمالات ہے۔ دلیل کہتی ہے کہ صِرفُ الوُجُودِ کُلُّ الاَشیاءِ وَلَیسَ بِشَیءٍ مِنهَا وہ خالص وجود ہے،

سب کچھ ہے لیکن بغیر تعین کے۔ سارے وجود اسی کے ہیں لیکن بطریق تعین نہیں بلکہ بطریق کمال مطلق۔ چونکہ اس کے اسماء اس سے جدا نہیں اس لیے اس کے اسمائے صفات بھی اسمائے ذات ہی ہیں۔ وہ سب خصوصیات جو اللہ میں ہیں رحمان میں بھی ہیں۔ رحمان بھی چونکہ کمال مطلق اور رحمت مطلق ہے اس لیے اس میں بھی وجود کے سب کمالات ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ مطلق نہیں ہوگا۔ قرآن شریف میں ہے:

اُدْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى [1] یعنی "اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر جس نام سے بھی پکارو اس کے سب ہی نام اچھے ہیں۔"

اللہ ہو یا رحمان ہو یا رحیم ہو یا باقی نام، سب نام اچھے اور پیارے ہیں۔ تمام اسمائے حسنیٰ حق تعالیٰ کی سب صفات کے جامع ہیں۔ چونکہ وہ مطلق ہے اس لیے کسی طرح محدود نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اسم اور مسمّیٰ یا ایک نام اور دوسرے نام میں کسی طرح مغایرت ہو۔

حق تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ ان ناموں جیسے نہیں جو ہم مختلف چیزوں کے مختلف اعتبار سے رکھ لیتے ہیں۔ اس کے نور و ظہور کی بھی یہ شکل نہیں کہ ایک لحاظ سے نور ہو اور ایک لحاظ سے ظہور۔ ظہور بعینہٖ نور ہے اور نور بعینہٖ ظہور ہے۔ اگرچہ یہ مثال بھی ناقص ہے۔ وجود مطلق کمال مطلق ہے اور کمال مطلق ہر لحاظ سے مطلق ہے۔ اس کے سب اوصاف علی الاطلاق ہیں۔ اس کی ذات اور صفات میں کسی طرح کی جدائی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

۱۔ سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۱۱۰

مشاہدے کا قدم دلیل و برہان سے آگے ہے

عام طور پر بات بات پر کہا جاتا ہے کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں یا دلیل یہ کہتی ہے۔ ایک عارف نے بھی کہا ہے: میں جہاں بھی گیا، یہ اندھا بھی اپنی لاٹھی لے کر وہاں آگیا۔ اندھے سے اس عارف کی مراد شیخ الرئیس بوعلی سینا تھے۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جو دلائل کی مدد سے حقیقت کا ادراک کرتا ہے، اس کی مثال اندھے کی سی ہے جو اپنی لاٹھی کی مدد سے راستا تلاش کرتا ہے۔ میں نے یہ دیکھا کہ میں جہاں بھی مشاہدے اور عرفان کی مدد سے پہنچا یہ اندھا بھی اپنی لاٹھی کھڑکھڑاتا ہوا آپہنچا۔ کہتے ہیں کہ اندھے سے مراد بوعلی سینا اور لاٹھی سے مراد دلیل و برہان ہے۔

اہل برہان اندھے ہیں

اہل برہان، اندھے اس لیے ہیں کہ انھیں مشاہدے کی قوت حاصل نہیں اگرچہ انھوں نے بھی توحید مطلق اور وحدت مطلق کے مسائل کو دلائل کی مدد سے ثابت کیا ہے۔ وہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ مبدائے وجود کمال مطلق ہے۔ پھر بھی معاملہ دلیل و برہان کا ہے اور دلیل کی دیوار کے پس پشت اہل برہان کو کچھ بجھائی نہیں دیتا۔ کوشش سے قلب اس کا ادراک کرتا ہے کہ واجب الوجود صِرفُ الْوُجود اور کُلِّ شَيْءٍ ہے۔

قلب کی مثال بچے کی سی رہتی ہے۔ بات کو سمجھانے کے لیے ایک ایک لفظ کا لقمہ اس کے منہ میں دینا پڑتا ہے۔ جو شخص دلائل کی مدد سے مسائل کا عقلی ادراک کرتا ہے اسے دل میں بٹھانے کے لیے تکرار اور مجاہدے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایمان، ادراک قلبی کا نام ہے

جب دل نے یہ بات قبول کرلی کہ اللہ تعالیٰ صرف الوجود اور کل الکمال ہے تو اب یہ ایمان بن گیا۔ پہلے یہ ادراک عقلی تھا۔ دلیل اور برہان سے ادراک عقلی حاصل ہوا۔ دل میں مفہوم کا ایک تصور قائم ہوا۔ جب دل نے حقیقت کو قبول کرلیا، خواہ عقلی دلائل سے یا قرآنی تعلیم سے تو پھر اسی کا نام ایمان ہوگیا۔ عقل نے ایک بات معلوم کی اور پھر دل کو سکھائی۔ جب تکرار اور ریاضت سے دل میں یہ راسخ ہوگیا کہ لَیْسَ فِی الدَّارِ غَیْرُہٗ دَیَّارٌ خدا کے سوا اس دار دنیا میں کچھ ہے ہی نہیں تو یہی ایمان ہے۔

یوں تو لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ[1] کا درجہ بھی انبیاء کے مشاہدے سے کم ہے۔ یہ بھی ایک درجہ ہے لیکن حق تعالیٰ کے جمال کا مشاہدہ اس سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں جو امور قابل غور ہیں ان میں تمیں دن، پھر چالیس دن اور اس کے بعد کے واقعات ہیں۔ اس کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے خسر حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ چلے تو انھوں نے کچھ دور جا کر اپنی بیوی سے کہا:

اِنِّیْ اٰنَسْتُ نَارًا[2] یعنی ''میں نے آگ دیکھی ہے۔'' یہ آگ جس کا احساس انھیں ہوا تھا، ان کے بیوی بچوں نے قطعاً نہیں دیکھی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں جاتا ہوں لَعَلِّیْ اٰتِیْکُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ[3] یعنی ''شاید میں تمہارے لیے اس کا ایک شعلہ لاسکوں۔''

جب وہ آگ کے قریب پہنچے تو ندا آئی: (یٰمُوْسٰی اِنِّیْ اَنَا رَبُّکَ

۱۔ سورۂ بقرہ: آیت ۲۶۰

۲ و ۳۔ سورۂ طٰہٰ: آیت ۱۰

اور اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا یہ اسی آگ میں سے آواز آئی تھی جو درخت میں لگی ہوئی تھی۔ یہ مشاہدہ تھا۔ جہاں اندھا اپنی لاٹھی کے سہارے پہنچا تھا اور عارف اپنے دل کی مدد سے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی کا مشاہدہ کرلیا۔

یہ کہنے سننے سے اونچی باتیں ہیں

یہ باتیں ہم کہتے ہیں اور آپ سنتے ہیں لیکن حقائق اس سے ارفع و اعلیٰ ہیں۔ اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰهُ جو نور درخت میں تھا اسے سوائے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا جیسا کہ جو وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آتی تھی کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کیا ہے؟ وحی کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں تھی۔ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل ہوتا تھا۔ پورا قرآن یکبارگی آپ کے قلب پر نازل ہو جاتا تھا۔ کس طرح؟ کون جانے۔ اگر قرآن یہی ہے تمیں پارے تو کسی معمولی دل پر تو ایک دفعہ میں نازل نہیں ہوسکتا۔

دل کا بھی کچھ اور ہی مسئلہ ہے

دل کا بھی کچھ اور مسئلہ ہے۔ قرآن ایک حقیقت ہے اور یہ حقیقت قلب پر وارد ہوتی ہے۔ قرآن ایک راز ہے۔ راز در راز۔ ایک سربستہ راز۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ اپنے ارفع مقام سے نیچے اترے تاکہ قلب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوسکے۔ پھر اور نیچے اترے تاکہ اسے دوسرے بھی سمجھ سکیں۔ انسان کا بھی یہی حال ہے۔ انسان بھی ایک راز اور سربستہ راز ہے۔ جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے، اس کے لحاظ سے تو انسان محض ایک جانور ہے اور جانور بھی ایسا کہ دوسرے جانوروں سے بدتر لیکن اس جانور کی

ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ انسانیت تک پہنچ سکتا ہے۔ کمال کے مدارج طے کرکے کمال مطلق تک رسائی حاصل کرسکتا ہے اور وہ کچھ بن سکتا ہے جو ہمارے وہم وگمان میں بھی مافوق ہے۔ پھر عدم کا راستا لیتا ہے۔

جو کچھ ہم محسوس کرتے ہیں وہ سب اعراض ہیں

پورا انسان ایک راز ہے۔ اس دنیا میں ظاہر میں ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے وہ بھی ایک مسئلہ ہے۔ ہم اجسام کا ادراک نہیں کرسکتے۔ ہم جوہر کا ادراک نہیں کرسکتے۔ ہم جس چیز کا ادراک کرتے ہیں وہ جوہر نہیں عرض ہوتی ہے مثلاً ہماری آنکھیں رنگ اور اسی قسم کی چیزیں دیکھتی ہیں، ہمارے کان آواز سنتے ہیں، ہماری زبان ذائقہ محسوس کرتی ہے اور ہمارے ہاتھ چیزوں کو چھوتے ہیں۔ یہ سب ظاہری چیزیں ہیں۔ اعراض ہیں۔ اصل جسم کہاں ہے؟ جب ہم کسی چیز کا بیان کرتے ہیں تو اس کے عرض، طول اور عمق کا ذکر کرتے ہیں۔ عرض طول اور عمق بھی اعراض یا کیفیات ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اس چیز میں کشش ہے۔ کشش بھی ایک عرض ہے۔ ہم جس کسی چیز کو بیان کرنے کے لیے اس کے جن اوصاف کا بھی تذکرہ کریں گے وہ سب عرض ہی ہوں گے۔ پھر خود جسم کہاں ہے؟ جسم بھی ایک راز ہے۔ احدیت کے راز کا سایہ۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ محض اسماء وصفات ہیں ورنہ یہ عالم سرتاسر عالم غیب ہے۔ شاید اسی مفہوم کے ایک درجے کو غیب وشہادت سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اس کائنات میں غیب وشہادت ساتھ ساتھ ہیں۔ جو چیزیں ہم سے غیب ہیں یعنی جن کا ہم ادراک نہیں کرسکتے وہی غیب ہیں۔ جس چیز کی بھی ہم تعریف کرنا چاہیں، سوائے اس کے اسماء، اوصاف اور آثار وغیرہ بیان کرنے کے اور کیا

کرسکتے ہیں؟ جو چیز کہ ظلِّ سرِّ مطلق ہے اس کا بشر ادراک نہیں کرسکتا کیونکہ انسانی ادراک ناقص ہے البتہ وہ ادراک کرسکتا ہے جو ولایت کے ذریعے اس مرتبے پر پہنچ گیا ہو جہاں حق تعالیٰ کی تجلی پورے طور پر اس کے قلب پر پڑ رہی ہو۔ یہ غیب وشہادت کا سوال ہر جگہ موجود ہے اس لیے اس طرح کی تعبیریں سب کی زبان پر ہیں جیسے عالم غیب، عالم ملکوت، عالم عقول وغیرہ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسم اعظم ہیں

اللہ تعالیٰ کے تمام نام ایک راز بھی ہیں اور ظاہر بھی ہیں۔ ان کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ یہی مفہوم ہے ھُوَ الظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ کا۔ جو ظاہر ہے وہ باطن بھی ہے اور جو باطن ہے وہ ظاہر بھی ہے۔ اس بنا پر حق تعالیٰ کے تمام اسماء میں وجود کے سب مراتب ہیں۔ ہر اسم میں تمام اسماء کا مفہوم شامل ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ رحمان ایک صفت یا ایک اسم ہو اور رحیم اس سے الگ اور اس کے مقابل ایک اسم ہو۔ اسی طرح منتقم ایک علیحدہ اسم ہو۔ یہ تمام اسماء ہر چیز پر حاوی ہیں۔

اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی تمام اسمائے حسنیٰ رحمان کے بھی ہیں، رحیم کے بھی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک نام کا ایک مطلب ہو اور دوسرے نام کا کچھ اور مطلب۔ اگر ایسا ہو تو رحمان حق تعالیٰ کی ذات کی ایک حیثیت کا بیان ہوگا اور مثلاً رحیم کسی دوسری حیثیت کا، اس طرح حق تعالیٰ کی ذات مجمع حیثیات ہو جائے گی۔ وجود مطلق میں یہ چیز محال ہے۔ وجود مطلق کی مختلف حیثیتیں نہیں ہوتیں۔ وجود مطلق اسی وجود مطلق کے لحاظ سے رحمان بھی ہے اور رحیم بھی۔ اس کی تمام ذات رحمان ہے اور تمام ذات رحیم۔

تمام ذات نور ہے اور تمام ذات اللہ۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کی رحیمیت کچھ چیز ہو اور رحمانیت اس سے مختلف کچھ اور۔ جو شخص معرفت کے ذریعے سے اس بلند ترین مقام تک پہنچے کہ خود ذات حق، نہ کہ محض اس کا جلوہ، اس شخص کے قلب پر متجلی ہو تو وہ خود بھی اسم اعظم ہوگا اور اسم اعظم کے جلوے سے متجلی بھی۔ یہ وہی قلب ہوسکتا ہے کہ جس پر قرآن نازل ہوا ہو، جو وحی کا سرچشمہ ہو اور جس میں جبریل امینؑ آتے رہے ہوں۔ ایسے قلب پر جو جلوہ ہوگا وہ تمام جلووں پر محیط ہوگا۔ یہ اسم اعظم خود رسول پاکؐ کی ذات مبارک ہے۔ نَحنُ الاَسماءُ الحُسنیٰ رسول خداؐ مقام تجلی میں اعظم الاسماء ہیں۔

ہمارے وجود بھی تجلی ہیں

جن موضوعات پر آج کی مجلس میں گفتگو ہوئی ان میں ایک مسئلہ تو سببیت کا تھا۔ ہم نے کہا تھا کہ حق تعالیٰ کے بارے میں سببیت کا سوال اٹھانا غلط ہے۔ اس کی ہمیں کوئی مثال نہیں ملتی سوائے دور دراز کی بعض مثالوں کے۔ ایک مسئلہ نُقطَۃُ تحتِ البَاءِ کا تھا۔ اگر یہ روایت واقعی کہیں آئی ہو تو میں نے اس کے متعلق کچھ عرض کیا تھا۔

اس کے علاوہ اسم بہ مراتب اسم ذات، اسم در مقام صفات، اسم در مقام تجلی فعلی، تجلی ذات برذات، تجلی ذات برصفات، تجلی ذات برموجودات (تجلی برموجودات نہیں) جیسے مسائل بھی زیر بحث آئے۔ جب ہم لوگ تجلی کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارا وجود بھی ایک تجلی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ یہاں سو آئینے رکھ دیجیے۔ ہر آئینے میں اسی ایک سورج کی روشنی منعکس ہوگی۔ ایک لحاظ سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سو روشنیاں ہیں مگر دراصل

ہر آئینے میں وہی ایک روشنی ہے۔ اسی ایک سورج کا جلوہ ہے جو سو آئینوں میں نظر آرہا ہے مگر چونکہ سورج کی روشنی محدود ہے اس لیے یہ مثال بھی دور دراز کی ہے۔

تعینات جلوے کا لازمی نتیجہ ہیں

تمام تعینات یعنی محدود اور متعین موجودات میں حق تعالیٰ کا جلوہ اور نور ہے۔ وہی ایک نور سب موجودات میں جلوہ فگن ہے۔ یہ نہیں کہ ہر متعین موجود کے لیے ایک الگ نور ہو۔ تعینات، نور کے جلوۂ فعلی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس صورت میں بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ میں اسم سے مراد مقام ذات کا اسم ہے اور اللہ جلوۂ ذات ہے جس میں تمام جلوے شامل ہیں۔ اس جامع جلوے ہی کا نام اللہ ہے۔ رحمان اور رحیم بھی اسی جامع جلوے کے نام ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ رحمان اس کی ایک صفت کا نام ہو اور رحیم دوسری صفت کا، بلکہ اللہ، رحمان اور رحیم تینوں ایک ہی جلوے کے نام ہیں۔ سب ایک ہی جلوہ ہے۔ وہی مکمل جلوۂ ذات اللہ بھی ہے، رحمان بھی اور رحیم بھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور صورت ممکن ہی نہیں کیونکہ اگر یہ صورت نہ ہو تو حق تعالیٰ کی ذات محدود ہو جائے گی اور محدود ہوگی تو ممکن ہو جائے گی، واجب نہیں رہے گی۔

اس تفصیل کے مطابق جو ہم نے ابتدا میں حمد کے متعلق عرض کی تھی، حمد اللہ کی ہوگی۔ اللّٰہ حق تعالیٰ کے جامع ظہور یا جامع جلوے کا نام ہے۔ رحمان اور رحیم بھی بعینہٖ اسی جامع جلوے کا نام ہیں۔ حمد سے مراد ہر حمد بھی ہوسکتی ہے اور حمد مطلق بھی۔ اسم اللہ کے متعلق تین احتمالات ہیں۔ یہ حق تعالیٰ کے جلوۂ جامع کا نام مقام ذات میں بھی ہوسکتا ہے مقام صفات میں بھی

(جسے مشیت مطلق کہتے ہیں اور ہر چیز اسی سے ہوتی ہے) اور مقام فعل میں بھی۔ جب ہم ان احتمالات مختلفہ کو مثلاً بسم اللہ کی آیت پر منطبق کرتے ہیں تو ہر احتمال کی صورت میں ایک خاص طرز کلام ہوجاتا ہے۔ اسی بنا پر ہم نے اللہ کے متعلق گفتگو کی جو ایک جامع اسم ہے مقام ذات میں بھی، مقام صفات میں بھی اور مقام تجلی فعلی میں بھی۔ ہم نے بسم اللہ پر گفتگو کرتے ہوئے اسم، اللہ، باء اور نقطہ کے متعلق عرض کیا اور رحمان اور رحیم کے متعلق چند بہت ہی مختصر باتیں بیان کیں۔

یقین ضروری ہے

ہمیں امید ہے کہ اس طرح کے مسائل پر بحث کی ضرورت کا اعتراف کیا جائے گا۔ بعض لوگ اس کا بالکل ہی انکار کرتے ہیں بلکہ بعض لوگ تو سرے سے عرفانی مسائل کے ہی منکر ہیں۔ جو لوگ ابھی حیوانیت کی منزل میں ہیں انھیں یقین نہیں آسکتا کہ اس منزل سے ماوراء بھی کچھ ہے جس کے وہ ابھی قائل نہیں۔ ہمارے لیے روحانی امور پر یقین ضروری ہے۔ یہی پہلا مرحلہ ہے اس کا کہ انسان اپنے آپ کو حرکت میں لائے۔ پہلی بات یہ ہے کہ آدمی انکار نہ کرے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آدمی ہر بات کا انکار کر دے جو اسے معلوم نہ ہو۔ غالباً شیخ الرئیس بو علی سینا کا قول ہے کہ جو شخص بغیر کسی دلیل کے کسی بات کا انکار کرتا ہے وہ فطرت انسانی سے خارج ہے۔

عقیدے کی بنیاد دلیل پر ہونی چاہیے

جس طرح کسی چیز کا ثبوت دلیل کا محتاج ہے اسی طرح کسی بات

سے انکار کے لیے بھی دلیل کی ضرورت ہے ورنہ یہ کہو کہ مجھے معلوم نہیں لیکن کچھ ضدی طبیعتیں ایسی ہیں کہ وہ ہر چیز کا انکار کر دیتی ہیں۔ چونکہ یہ لوگ سمجھتے نہیں اس لیے فطرت انسانی سے خارج ہیں۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ اگر چیز کو تسلیم کرے تو دلیل سے تسلیم کرے اور اگر رد کرے جب بھی دلیل سے رد کرے ورنہ یہ کہہ دے کہ مجھے معلوم نہیں اور چونکہ میں نہیں جانتا اس لیے ممکن ہے ایسا ہو اور ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ کہا گیا ہے: کُلُّ مَا قَرَعَ سَمْعَکَ ذَرْهُ فِیْ بُقْعَةِ الْاِمْکَانِ جو کچھ سنو اس کے متعلق یہ ضرور مانو کہ ممکن ہے صحیح ہو اور ممکن ہے کہ صحیح نہ ہو لیکن انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے؟ اس عالم کے ماوراء تک ہماری رسائی نہیں ہے۔ خود اس دنیا کے متعلق بھی ہماری معلومات ناقص ہیں۔ کچھ مسائل اس وقت معلوم ہیں۔ بعد میں کچھ اور مسائل ظاہر ہوں گے۔ اب سے سو سال پہلے تک یہ دنیا کتنی نامعلوم تھی۔ اس میں کتنی باتیں ایسی تھیں جن کا کسی کو علم تک نہیں تھا۔ اب بہت سی باتیں معلوم ہوگئی ہیں۔ آئندہ اور بہت سی باتوں کا انکشاف ہوگا۔ ابھی تک ہم اس کائنات کو نہیں سمجھے۔ انسان اس کائنات کا ادراک نہیں کرسکتا ہے، پھر اولیاء کے مشاہدات کا انکار کیوں کرتا ہے؟ جو شخص حقائق و معارف کا انکاری ہے، اس کا دل حقائق و انوار کی تجلی سے محروم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ جو کچھ اہل معرفت کہتے ہیں، اس کے متعلق کہتا ہے کہ یہ سب من گھڑت باتیں ہیں۔ چونکہ وہ خود محروم ہے اس لیے ان باتوں کو من گھڑت بتلاتا ہے۔ اس کے دل میں یہی ہے کہ یہ باتیں من گھڑت ہیں مگر یہ باتیں تو قرآن میں بھی ہیں۔ ان کے متعلق اسے ایسا کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ جن باتوں کو وہ من گھڑت کہتا ہے وہ قرآن و سنت ہی سے ماخوذ ہیں، پھر انکار کرنے کی وجہ کیا ہے؟

جو بات معلوم نہ ہو اس کا انکار کفر ہے

یہ بھی کفر کا ایک درجہ ہے، گو شرعی کفر نہ ہو لیکن کفران تو ہے ہی کہ آدمی کو جو چیز معلوم نہ ہو اس کا انکار کر دے۔ انسان کی مصیبتوں کی جڑ یہی ہے کہ جب وہ حقائق کا ادراک نہیں کر سکتا تو ان کا انکار کر بیٹھتا ہے۔ وہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا جہاں تک اولیاء پہنچے ہیں اس لیے وہ ان کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ کفر جحودی کی بدترین قسم ہے۔ پہلا قدم یہ ہے کہ آدمی اس بات کا انکار نہ کرے جو کتاب و سنت میں آئی ہے، جس کا اولیاء اقرار کرتے ہیں، جس کے عرفاء اپنے ادراک کے مطابق قائل ہیں اور جس کا فلاسفہ کو اعتراف ہے۔ اگر خود اس نے درک نہیں کیا ہے تو کہہ دے کہ مجھے معلوم نہیں مگر یہ مردود تو کہتا ہے کہ جب تک میں اپنے تیز نشتر سے خدا کو چیر پھاڑ کر نہیں دیکھ لوں گا میں تو مانوں گا ہی نہیں۔ یہ جحود ہے جو اللہ کو بھی اپنے نشتر کے نیچے دیکھنا چاہتا ہے۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ جو باتیں انبیائے کرامؑ اور اولیاء عظام نے بتلائی ہیں ہم ان کا انکار نہ کریں۔ اگر شروع ہی میں انکار کر دیں گے تو اگلا قدم اٹھا ہی نہیں سکتے۔ جو شخص اس کا منکر ہے کہ کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے وہ اصلاً جستجو ہی نہیں کرے گا۔ جو آدمی آگے بڑھنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے اس بھول بھلیاں سے نکلے۔ سب سے پہلے تو وہ اس کا اعتراف کرے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ باتیں صحیح ہوں۔ اگر آدمی اس کا انکار کرے گا تو یہ انکار کی دیوار ہمیشہ کے لیے اُس کا راستا روک دے گی۔ پھر خدا سے دعا کرے کہ خدا اُس کے لیے کوئی ایسا راستا کھول دے جس سے وہ وہاں پہنچ جائے جہاں اسے پہنچنا چاہیے۔

اگر آدمی انکار نہیں کرے گا اور دعا کرے گا کہ اس کے لیے راستا

کھل جائے تو خدا اسے محروم نہیں رکھے گا اور آہستہ آہستہ راستا کھل جائے گا۔

مجھے امید ہے کہ ہماری یہ حالت نہیں ہوگی اور ہم کتاب و سنت کا انکار نہیں کریں گے۔ ہوتا یہ ہے کہ آدمی کتاب و سنت کا تو قائل ہوتا ہے لیکن جب کتاب و سنت میں وارد کوئی چیز اس کی سمجھ میں نہیں آتی تو زیادہ سے زیادہ وہ وہاں یہ نہیں کہتا کہ ایسا نہیں ہے لیکن جب کوئی دوسرا شخص اس سے یہ کہتا ہے کہ کتاب و سنت میں یہ آیا ہے اس وقت وہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے معلوم نہیں بلکہ اسے لغو بتلاتا ہے۔

مطلق انکار راستے کا پتھر ہے

مطلق انکار آدمی کو بہت سے مسائل سے محروم کر دیتا ہے اور اس کے راہ راست پر چلنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ جن باتوں کی اولیاء نے کشفی تصدیق کی ہے، ان کے متعلق کم از کم یہ احتمال تو دیجئے کہ ممکن ہے یہ درست ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص صریحاً نہ کہے کہ یہ ممکن ہے لیکن یہ کہ آدمی قطعی انکار کر دے اور یہ کہے کہ یہ مسائل ہیں ہی نہیں، یہ لغویات ہیں۔ ایسا آدمی پھر آگے بڑھنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر کامیابی حاصل کرنی چاہتا ہے تو اپنے دل سے انکار کو نکال پھینکے اور پھر قدم آگے بڑھائے۔

ہم جحود کو دل سے نکال دیں

مجھے امید ہے کہ ہم اس تکذیب کے حجاب کو اپنے دل سے دور کر دیں گے اور خداوند تبارک و تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ ہمیں قرآن کی

زبان سے یعنی جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے اور جو ایک خاص طرح کی زبان ہے اس سے آشنائی بخشے۔ قرآن بھی انسان کی طرح گوناگوں صلاحیتوں کا حامل ہے۔ قرآن ایک دسترخوان ہے جو خدا نے ہمارے لیے بچھایا ہے۔ یہ ایک بہت وسیع دسترخوان ہے جس سے ہر شخص اپنی خواہش کے موافق غذا حاصل کرسکتا ہے۔ اگر آدمی بیمار نہ ہو اور اس کی بھوک جاتی نہ رہی ہو کیونکہ دل کے امراض میں بھوک نہیں رہتی، ہاں یہ ایک وسیع دسترخوان ہے، جس سے سب استفادہ کرسکتے ہیں جس طرح یہ دنیا ایک وسیع دسترخوان ہے جس سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کوئی گھاس کھاتا ہے تو کوئی میوے۔ کوئی کسی طرح استفادہ کرتا ہے اور کوئی کسی طرح۔ انسان ایک طرح سے استفادہ کرتا ہے تو حیوان دوسری طرح اور جو انسان حیوانیت کے درجے میں ہیں، وہ کسی اور طرح سے۔ جوں جوں سطح بلند ہوتی جاتی ہے، اس خدائی دسترخوان سے جو وجود سے عبارت ہے، استفادے کا طریقہ بھی بہتر ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن بھی ایک وسیع دسترخوان ہے جو سب کے لیے بچھا ہوا ہے۔ ہر شخص اپنی بھوک اور خواہش کے مطابق اس سے فائدہ اٹھانے کی راہ نکال سکتا ہے۔ اعلیٰ ترین استفادہ اس سے مخصوص ہے جس پر یہ نازل ہوا تھا اور جو اس کا اولین مخاطب ہے۔ اِنَّمَا یَعرِفُ القُرآنَ مَن خُوطِبَ بِہ.

نبوت کا قطعی انکار

لیکن ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ ضروری ہے کہ اس دسترخوان سے ہم بھی بہرہ اندوز ہوں۔ اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے ہم یہ خیال دل سے نکال دیں کہ طبیعی اور مادی مسائل کے سوا کسی چیز کا وجود ہی

نہیں اور قرآن فقط ان ہی طبیعی اور اجتماعی مسائل کو بیان کرنے کے لیے آیا ہے اور اس کا تعلق صرف دنیوی زندگی سے ہے۔ ایسا خیال نبوت کا قطعی انکار ہے۔ قرآن، انسان کو انسان بنانے کے لیے آیا ہے اور یہ سب ذریعہ ہے ایک مقصد کے حصول کا۔

دعائیں اور عبادتیں وسیلہ ہیں

تمام عبادات اور دعائیں وسیلہ اور ذریعہ ہیں اس مقصد کا کہ انسان کے اصل جوہر کھلیں۔ انسان میں جو صلاحیتیں خفتہ ہیں وہ بیدار ہو جائیں۔ انسان، انسانیت کے مرتبے تک پہنچ جائے۔ انسان بالقوہ انسان بالفعل بن جائے۔ طبیعی انسان، خدائی انسان بن جائے تاکہ اس کی ہر چیز خدا کی ہو جائے۔ وہ جو کچھ دیکھے اور سمجھے، حق دیکھے اور سمجھے۔ انبیاؑء اسی لیے آئے ہیں۔ وہ بھی ایک ذریعہ ہیں۔ انبیاؑء اس لیے نہیں آئے کہ وہ حکومت قائم کریں۔ انھیں حکومت کاہے کے لیے چاہیے تھی۔ حکومت بھی اپنی جگہ ہے لیکن یہ بات نہیں کہ انبیاؑء فقط دنیا کا انتظام کرنے آئے تھے۔ حیوانات کی بھی دنیا ہے، وہ بھی اپنی دنیا کا نظم ونسق چلاتے ہیں۔

عدل حق تعالیٰ کی صفت ہے

جو چشم بصیرت رکھتے ہیں ان کی نظر میں عدل کی بحث حق تعالیٰ کی ایک صفت کی بحث ہے۔ عدل الٰہی کا انصرام بھی انبیاؑء کا ایک کام ہے۔ وہ انصاف پر مبنی حکومت بھی قائم کرتے ہیں لیکن یہ سب باتیں ذریعہ ہیں اس کا کہ انسان ایک مرتبے پر پہنچ جائے جو انبیاء علیہم السلام کی آمد کا مقصد ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں ہماری مدد کرے!

پانچواں درس

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰانِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

ایرانی، ترک اور عرب کے مابین انگور کا قضیہ

بقیہ مطالب بیان کرنے سے پہلے ایک بات عرض کر دینا مناسب ہے جو شاید مفید بھی ہے اور ضروری بھی وہ یہ کہ اہل علم اور اہل نظر میں بسا اوقات اختلاف اس لیے پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر گروہ کی اپنی ایک خاص زبان ہے۔

معلوم نہیں آپ نے بھی یہ قصہ سنا ہے کہ نہیں؟ تین آدمی تھے جن میں سے ایک ایرانی تھا، دوسرا ترک اور تیسرا ایک عرب تھا۔ وہ آپس میں یہ بحث کر رہے تھے کہ آج دوپہر کے کھانے پر کیا چیز کھائی جائے۔ ایرانی نے کہا کہ انگور مناسب رہیں گے۔ عرب نے کہا: نہیں، ہم تو عنب کھائیں گے۔ ترک بولا کہ ہمیں یہ دونوں چیزیں منظور نہیں ہم تو اوزُم کھائیں گے۔ چونکہ ایک دوسرے کی زبان سمجھتے نہیں تھے اس لیے آپس میں اختلاف ہوا۔ کہتے ہیں کہ آخر ان میں سے کوئی گیا اور انگور لے آیا۔ دیکھا تو سب ایک ہی چیز کے لیے کہہ رہے تھے۔

مختلف زبانوں میں ایک ہی بات کو مختلف الفاظ میں کہا جاتا ہے مثلاً فلسفیوں کی ایک خاص زبان ہے۔ ان کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ اسی طرح

عرفاء کی بھی اپنی زبان ہے اور ان کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ فقہاء کی بھی اپنی اصطلاحات ہیں۔ شعراء کی اپنی مخصوص شعری زبان ہے۔ اولیائے معصومین علیہم السلام کا طرز کلام سب سے جداگانہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تین یا چار گروہوں میں سے کس کی زبان اہل عصمت کی زبان سے نزدیک تر ہے اور کون سی زبان وحی کی زبان سے زیادہ قریب ہے۔ میرے خیال میں کسی آدمی کو، کسی عاقل کو اس میں اختلاف نہیں ہوگا کہ حق تعالیٰ ہے، وہ موجودات کا سرچشمہ ہے اور یہی سرچشمہ تمام موجودات کے وجود کی علت ہے۔ کوئی شخص اس کا قائل نہیں ہے کہ آپ اپنے کوٹ پتلون سمیت خدا ہیں، نہ کوئی عاقل یہ تصور کرسکتا ہے کہ فلاں شخص اپنے عمامہ و ریش و عصا سمیت خدا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ سب مخلوق ہیں۔

آدم کو خدا مت کہو آدم خدا نہیں
لیکن خدا کے نور سے آدم جدا نہیں

لیکن علت و معلول کو جس طرح بیان کیا جاتا ہے اور اس سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے اس میں فرق کی وجہ سے اختلاف رونما ہو جاتا ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ جو حضرات عرفاء کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے، وہ کیا چاہتے تھے؟ کیوں اس طرح کے الفاظ استعمال کرتے تھے؟ انھیں اس خاص طرز کی تعبیر پر کس بات نے آمادہ کیا۔

مختلف گروہوں اور ان کی تعبیروں میں تصفیہ کی راہ

اب میں چاہتا ہوں کہ ان مختلف گروہوں میں تصفیہ کرادوں کیونکہ یہ سب ایک ہی بات کہتے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ سب فلاسفہ کو بے قصور ٹھہراؤں یا سب عارفوں یا سب فقہاء کی صفائی پیش کروں۔ نہیں،

یہ بات نہیں ہے:

اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

ان میں بہت سے دکاندار ہیں جو وہی باتیں کرتے ہیں جو ان کی تجارت کے فروغ کا باعث ہوں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان تمام گروہوں میں بہت سے اشخاص نیک ہیں۔ ان میں جو اختلاف ہے وہ مدرسے کی پیداوار ہے۔ اس کی مثال بالکل اس اختلاف کی ہے جو اصولیوں اور اخباریوں میں ہے۔ بعض اوقات شاید اخباری، اصولیوں کی تکفیر پر اتر آتے ہیں اور اصولی، اخباریوں کو جاہل کہتے ہیں حالانکہ ان کے مقصد میں فرق نہیں۔ مقصد دونوں کا ایک ہے۔

اب ہماری بحث کا نقطہ یہ ہے کہ فلاسفہ کا ایک طبقہ علت العلل، معلول اول، معلول ثانی جیسی اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ فلاسفہ اکثر علیت و معلولیت کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں خصوصاً ماقبل اسلام کے فلاسفہ علیت و معلولیت، سببیت و مسببیت اور مبداء و اثر جیسی ترکیبیں ان کی پسندیدہ اصطلاحات ہیں۔

ہمارے فقہاء بھی علیت و معلولیت جیسے الفاظ کے استعمال سے پرہیز نہیں کرتے اور نہ انھیں خالقیت و مخلوقیت جیسے الفاظ کے استعمال سے انکار ہے۔ ایک طبقہ اہل عرفان کا ہے۔ وہ اس اختلاف کی بنیاد پر جو ان کے اور دوسروں کے درمیان ہے بالکل ہی مختلف تعبیرات استعمال کرتے ہیں جیسے ظاہِر، مُظہِر، تجلّی وغیرہ۔ ان کے علاوہ وہ کچھ اور ایسے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں جن پر بعض ظاہر بینوں کو اعتراض ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ ایسے الفاظ کیوں استعمال کرتے ہیں اور کیا وجہ ہے کہ ائمہ علیہم السلام نے بھی اسی قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ائمہؑ نے کہیں

علیت و معلولیت اور سببیت اور مسببیت وغیرہ کا استعمال کیا ہو البتہ ان کے کلام میں خالقیت و مخلوقیت ہے، تجلّی ہے، ظاہر و مظہر ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اہل عرفان نے فلاسفہ کی اصطلاحات سے کیوں گریز کیا ہے اور انھوں نے عوام الناس کا طرز بیان بھی کیوں اختیار نہیں کیا۔ انھوں نے ایک اور ہی اسلوب اختیار کیا ہے جس پر اہل ظاہر عموماً اعتراض کرتے ہیں۔ آیئے، دیکھیں اس کی کیا وجہ ہے۔

علت و معلول

علت و معلول[1] کی بنیاد پر ایک موجود کو علت مانا جاتا ہے اور کسی دوسرے کو معلول۔ علیت و معلولیت کا اصول یہ ہے کہ علت ایک طرف ہو اور معلول دوسری طرف۔ اس ایک طرف سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مکاناً ایک دوسرے سے مختلف ہوں یعنی وہ الگ الگ دو جگہ واقع ہوں، جیسے مثلاً سورج کی روشنی اور خود سورج۔ سورج میں خود بھی روشنی ہے لیکن اس سے روشنی نکلتی بھی ہے۔ اس طرح کہ سورج ایک جگہ ہے اور اس سے نکلنے کی وجہ سے یہ روشنی اس کا اثر اور معلول ہے لیکن سوال یہ ہے کہ واجب الوجود کے بارے میں بھی اس طرح کی علیت و معلولیت کا تصور کیا جاسکتا ہے جس طرح کی علیت و معلولیت نیچر میں پائی جاتی ہے جیسے مثلاً آگ، حرارت کی علت ہے اور سورج، روشنی کی۔ نیچر میں تو معلول، علت کا اثر ہوتا ہے اور

۱۔ انسان اپنی روزمرہ زندگی میں علت اور معلول کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کو سمجھتا ہے۔ دنیا ارسطو کے زمانے سے یعنی تقریباً ۳۰۰۰ سال سے علت و معلول Causality کی فلسفیانہ اصطلاح کو جانتی ہے۔ Causality کی اس قدیم اصطلاح کے بعد جدید مغربی فلسفیوں نے Determinism یعنی جبریت اور Existentialism یعنی وجودیت کی جو اصطلاحات استعمال کی ہیں وہ بھی اسی نظریۂ علت و معلول کے مظاہر ہیں۔ (رضوانی)

علت اور معلول جگہ کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ علت ایک جگہ ہوتی ہے اور معلول دوسری جگہ۔

اثر اور مؤثر

نیچر میں اثر اور مؤثر بھی عموماً اس طرح ہوتے ہیں کہ جگہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ اب کیا ہم یہ کہیں کہ مبدائے اعلیٰ اور مخلوقات بھی اسی طرح ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ خالق ایک مکان میں اور مخلوق ایک مکان میں۔ خالق ایک زمان میں اور مخلوق ایک زمان میں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس کا تصور بہت مشکل ہے۔ یہی بتلانا مشکل ہے کہ موجود مجرد کے وجود کی کیا شکل ہے؟ خصوصاً مبدائے اعلیٰ کے متعلق چاہے تعبیر کا کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے، اس کو بیان کرنا ناممکن ہے کہ حق تعالیٰ کی قیومیت کس طرح موجودات کا احاطہ کیے ہوئے ہے؟ قرآن جو کہتا ہے کہ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ[1] یعنی "تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔" اس مَعَكُمْ کا کیا مطلب ہے؟ کیا خدا آدمی کے ساتھ اس کے پہلو میں ہے؟

هُوَ مَعَكُمْ کا مفہوم

اس طرح کی تعبیر اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ حقیقت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں اس لیے واقعیت کو بیان کرنے کے لیے نزدیک ترین الفاظ کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ قرآن و سنت میں بھی قریب ترین الفاظ ہی کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس مسئلے کو سمجھنا بہت مشکل ہے کہ خالق کہاں ہے؟ خالق مخلوق کے ساتھ کس طرح ہے؟ کیا خالق اور مخلوق کی وہی صورت ہے جو

۱۔ سورۂ حدید: آیت ۴

آگ اور اس کے اثر کی ہے؟ یا ان میں وہ تعلق ہے جو نفس اور آنکھ، ناک اور دیگر قویٰ میں۔ شاید یہ دوسری مثال حقیقت سے بہت قریب ہو لیکن اس مثال سے بھی مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوسکتا۔ خالق پوری طرح مخلوق کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور یہ احاطہ قیومی احاطہ ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا مشکل ہے۔ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ موجودات پر یہ قیومی احاطہ اس طرح ہے کہ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں خدا نہ ہو۔

لَوْ دُلِّيتُمْ بِحَبْلٍ اِلَى الْاَرَضِيْنَ السُّفْلٰى لَهَبَطْتُمْ اِلَى اللّٰهِ یعنی "اگر تمہیں سب سے نچلی زمینوں تک بھی لٹکا دیا جائے تب بھی تم وہاں خدا ہی کو پاؤ گے۔" یہ بھی محض کہنے کا ایک طریقہ ہے مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ سب کچھ اللہ ہی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں خدا مخلوق میں حلول کر گیا ہے۔ یہ غلط ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا لیکن تعبیرات و اصطلاحات ایسی لائی جاتی ہیں جن سے غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ جو آدمی عبا اور عمامہ پہنے ہوئے ہے وہ حق تعالیٰ ہے۔ ایسی بات تو کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس نہیں کرے گا۔ ہم تعبیر کے لیے صرف ایسے الفاظ اختیار کرسکتے ہیں جو مفہوم سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوں۔ جو شخص ان مسائل سے واقف نہیں ہے اس کی توجہ خالق و مخلوق کے تعلق کی طرف مبذول کرانے کے لیے بعض دفعہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ بھی صحیح ہے کہ سب کچھ اللہ ہی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی خاص چیز کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ حق تعالیٰ ہے۔ دیکھیے مسلمان فلسفی یہ کہتے ہیں کہ صِرْفُ الْوُجُوْدِ كُلُّ الْاَشْيَاءِ وَلَيْسَ بِشَيْءٍ مِنْهَا اللہ تعالیٰ خالص وجود ہے، وہ سب کچھ ہے مگر ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ بظاہر یہ دو متضاد باتیں ہیں مگر کہنے

کا مطلب یہ ہے کہ ذات خداوندی ہر نقص سے پاک ہے۔ وہ خالص وجود ہے۔ اس میں کوئی کمی یا عیب نہیں۔ وہ ہر کمال سے متصف ہے اور باقی سب موجودات ناقص ہیں۔

اس لیے وہ لَیسَ بِشَیءٍ مِنھَا ہے۔ اگر حق تعالیٰ دوسری موجودات میں سے ہوگا تو ناقص ہو جائے گا مگر وہ ایک مکمل وجود ہے جو ہر نقص سے پاک ہے اور جب وہ ہر نقص سے پاک ہے تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی ایسا کمال ہو جو اس میں نہ ہو۔ جو کمال بھی کسی مخلوق میں ہے وہ اسی کے کمال کا جلوہ اور ترشح ہے۔ جب ہر کمال اسی کا جلوہ ہے تو وہ اپنی ذات میں کل کمال ہے۔ کُلُّ الْاَشْیَاء کا مطلب ہے کُلُّ الْکَمَال اور لَیسَ بِشَیءٍ مِنھَا کے معنی ہیں کہ اس میں کوئی نقص نہیں کُلُّ الْاَشْیَاء کا یہ مطلب نہیں کہ تم بھی خدا ہو۔

اسی لیے کہتے ہیں کہ لَیسَ بِشَیءٍ مِنھَا یعنی یہ کہ وہ تمام کمال ہے جبکہ کوئی دوسرا موجود تمام کمال نہیں۔ چونکہ وہ تمام کمال ہے اس لیے ہر کمال سے متصف ہے۔ اسی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح کی ایک اور مثال ہے۔ فرض کیجیے کہ کوئی ایسا شخص جسے ان مسائل سے آگاہی نہیں ہے یہ مصرع سنتا ہے ؏

چون کہ بے رنگی اسیرِ رنگ شد

اگرچہ اس مصرع کا حقیقت الٰہیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق تو دراصل ایسی لڑائی سے ہے جو دو آدمیوں کے درمیان ہو مگر چونکہ لوگ مطلب نہیں سمجھتے اس لیے کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ تو کفر ہے حالانکہ اس کا تعلق اس مسئلے سے قطعی نہیں ہے اور اس کا جو مطلب سمجھا جاتا ہے وہ غلط ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ دنیا میں جو جنگیں ہوتی ہیں وہ کس بات پر ہوتی ہیں۔

لڑائی کیوں ہوتی ہے؟

لڑائی کس بات پر ہوتی ہے؟ جنگ کی بنیاد کیا ہے؟ یہاں جو رنگ کا لفظ آیا ہے اس سے مراد ہے تعلق۔ دوسری جگہوں پر اور بعض دوسرے شعراء کے کلام میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں آیا ہے۔ کسی نے کہا ہے ؏

از آنچہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

رنگ اور بے رنگی۔ رنگ کے معنی ہیں تعلق اور بے رنگی سے مراد ہے بے تعلقی۔ اگر کسی خاص چیز سے طبیعت کو تعلق اور لگاؤ نہ ہو تو جھگڑا نہیں ہوسکتا۔ جھگڑے کی وجہ یہی ہے کہ آدمی کی طبیعت کو کسی چیز سے لگاؤ ہوتا ہے۔ وہ اسے اپنے لیے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اصل فطرت میں رنگ نہیں ہے۔ اگر تعلق کا رنگ بیچ میں سے نکل جائے تو پھر جھگڑا نہیں ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصے میں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام بے تعلق تھے اگر فرعون بھی اسی طرح بے تعلق ہوتا تو یہ سب جھگڑا پیش نہ آتا۔ اگر کسی جگہ سب انبیاء و مرسلینؑ بھی جمع ہو جائیں تو بھی جھگڑا نہ ہو۔ یہ سب جھگڑا تعلق ہی کا ہے۔ بے رنگی اسیر رنگ شد۔

فطرت جو بے تعلق تھی جب تعلق کی اسیر ہوگئی تو جھگڑے پیدا ہوگئے۔ اگر یہ تعلق کا کانٹا نکال دیا جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون بھی آپس میں صلح کرلیں گے۔

اس مضمون کا تعلق حقانیت کے موضوع سے ہے ہی نہیں۔ جس کسی نے اس مصرع پر اعتراض کیا ہے اسے یہ خیال نہیں آیا کہ یہ مصرع تو ان دو آدمیوں کے متعلق ہے جو آپس میں لڑ رہے ہوں نہ کہ اصل مسئلے سے۔

ائمہ علیہم السلام کی دعاؤں کے کلمات

جو کلمات ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی دعاؤں میں آئے ہیں وہ تو آپ کو معلوم ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ کیا اہل عرفان نے بھی اسی طرح کے کلمات استعمال کئے ہیں جن کی بنا پر حقیقت سے ناواقف لوگوں نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے یا ان کے کلمات ان کلمات سے مختلف ہیں جو ائمہؑ کی زبان پر ہیں۔ یہ موضوع سیر روحانی سے متعلق ہے۔

مناجات شعبانیہ میں یہ کلمات آئے ہیں:

اِلٰهِی هَبْ لِی كَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَیْکَ وَاَنِرْ اَبْصَارَ قُلُوْبِنَا بِضِیَاءِ نَظَرِهَا اِلَیْکَ حَتّٰی تَخْرِقَ اَبْصَارُ الْقُلُوْبِ حُجُبَ النُّوْرِ فَتَصِلَ اِلٰی مَعْدِنِ الْعَظَمَةِ وَ تَصِیْرَ اَرْوَاحُنَا مُعَلَّقَةً بِعِزِّ قُدْسِکَ. اِلٰهِی وَاجْعَلْنِی مِمَّنْ نَادَیْتَهٗ فَاَجَابَکَ وَلَاحَظْتَهٗ فَصَعِقَ لِجَلَالِکَ.[1]

اے میرے خدا! مجھے توفیق عطا فرما کہ میں سب سے بالکل کٹ کر تیرا ہی ہو رہوں۔ ہمارے دل کی آنکھوں کو اپنے دیدار کے نور سے منور فرما تاکہ دل کی آنکھیں نور کے پردوں کو چاک کر کے عظمت کے سرچشمے تک پہنچ جائیں اور ہماری ارواح تیرے خطیرہ قدس میں معلق ہو جائیں۔

اے میرے خدا! مجھے ان لوگوں میں سے قرار دے جن کو تو نے آواز دی تو انھوں نے لبیک کہا اور تو نے ان پر نظر کرم ڈالی تو وہ تیرے جلال کے باعث ہوش و حواس کھو بیٹھے۔

ان الفاظ کا کیا مطلب ہے؟ اب کیا فرماتے ہیں یہ حضرات؟ یہی کچھ تو اہل عرفان بھی کہتے ہیں۔ ہمارے سب ائمہ علیہم السلام

۱۔ مفاتیح الجنان، اعمال مشترکہ ماہ شعبان

جو یہ دعا پڑھا کرتے تھے تو ان کا مقصد کیا تھا؟

كَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَیْکَ سے کیا مراد ہے؟

هَبْ لِی كَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَیْکَ کے کیا معنی ہیں؟

امام خدا سے دعا مانگتے ہیں

امام كَمَالُ الْاِنْقِطَاعِ نصیب ہونے کی خدا سے دعا مانگتے ہیں حالانکہ سیر روحانی خود ان کا اپنا فعل ہے مگر وہ اس کی دعا مانگتے ہیں۔ آخر یہ سب کیوں؟ اَنِرْ قُلُوْبَ اَبْصَارِنَا یہ دل کی آنکھیں کیا ہوتی ہیں جن سے وہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں؟ پھر دل سے کیا مراد ہے اور دل کی آنکھوں کا کیا مطلب ہے؟

پھر ان سب کی غایت یہ بیان کی گئی ہے:

تَخْرِقُ اَبْصَارُ الْقُلُوْبِ حُجُبَ النُّوْرِ یعنی دل کی آنکھیں نور کے پردوں کو چاک کر کے فَتَصِلَ اِلٰی مَعْدِنِ الْعَظَمَةِ وَ تَصِیْرَ اَرْوَاحُنَا مُعَلَّقَةً بِعِزِّ قُدْسِکَ عظمت کے سرچشمے تک پہنچ جائیں اور ہماری ارواح تیرے خطیرہ قدس میں معلق ہو جائیں۔ یہاں معلق ہو جانے سے کیا مراد ہے؟

پھر اس کے بعد جو ہے کہ

اِلٰهِی وَاجْعَلْنِی مِمَّنْ نَادَیْتَهٗ فَاَجَابَکَ وَلَاحَظْتَهٗ فَصَعِقَ لِجَلَالِکَ تو یہاں جلال کے سبب ہکا بکا رہ جانے اور ہوش و حواس کھو بیٹھنے کا کیا مطلب ہے؟ یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں کہی گئی ہے۔ اہل عرفان کی اصطلاح میں جسے فنا کہا جاتا ہے کیا یہ اس سے کچھ مختلف چیز ہے؟

فَصَعِقَ لِجَلَالِکَ میں بھی عظیم راز پنہاں ہے۔ لفظ صَعِقَ[1] قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بھی ذکر ہوا ہے۔

یہ نہایت باعظمت مقام ہے۔ یہ تمام مراحل جو ذکر کیے گئے ہیں بہت عظیم ہیں اور درجہ بدرجہ بلند مراتب حاصل کرتے ہوئے سالک وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں دل کی آنکھیں سراپردوں کو چاک کر کے عظمت کے سرچشمے تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ عظمت کا سرچشمہ کیا ہے اور اس تک پہنچ جانے سے کیا مراد ہے؟

کیا یہ وہی وصول باللہ نہیں جس کی اہل عرفان بات کرتے ہیں؟

کیا سرچشمۂ عظمت حق تعالیٰ کے علاوہ بھی کچھ ہوسکتا ہے؟

سرچشمۂ عظمت تو وہی ہوگا جس سے سب عظمتیں حاصل کی جاسکیں اس سرچشمۂ عظمت تک وصول کے بعد ہی تَصِیرُ اَرْوَاحُنَا مُعَلَّقَةً بِعِزِّ قُدْسِکَ کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ بھی وہی بات ہے جو اہل عرفان کہتے ہیں۔

کوئی شخص جس نے حق تعالیٰ اور مخلوقات کے رشتے پر غور کیا ہو، اس تعلق کی تعبیر کے لیے علت و معلول کے الفاظ استعمال نہیں کرے گا۔ ان الفاظ کا استعمال درحقیقت تعبیر کی نارسائی ہے۔ اس تعلق کو علت و معلول اور اثر و مؤثر کے الفاظ سے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ خالق و مخلوق کے الفاظ بھی محض عوام الناس کے ذوق کی پیروی ہے۔ ان سب سے بہتر تعبیر تجلی ہے فَتَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ مگر یہ بھی اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے محض قریب ترین لفظ ہے جس کو کسی طرح الفاظ میں ادا نہیں کیا جاسکتا۔

۱۔ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا (سورۂ اعراف: آیت ۱۴۳)

وہ مسئلہ جس کا تصور اس کی تصدیق سے مشکل تر ہے

حق اور خلق کے درمیان ربط ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا تصور مشکل ہے لیکن تصور کے بعد اس کی تصدیق آسان ہے لیکن دقت یہ آپڑی ہے کہ ایسے موجود کا تصور کیسے کیا جائے جس سے خالی تو کوئی بھی جگہ نہیں ہے لیکن پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ فلاں جگہ ہے۔ وہ ظاہر اشیاء ہے، وہ باطن اشیاء ہے اور اس کی معلول بھی ہیں۔ وہ ظاہر میں بھی مؤثر ہے اور باطن میں بھی۔ لَا یَخْلُوْا مِنْهُ الشَّیْءُ.

اب بتلایئے کہ یہ سب بیان کرنے کے لیے موزوں اور مناسب الفاظ کہاں سے لائے جائیں اور اس مطلب کو کیونکر ادا کیا جائے؟ جو الفاظ بھی لائے جائیں، مطلب ادا نہیں ہوسکتا۔ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ جو اس کے اہل ہیں وہ دعا کریں اور اس طرح دعا کریں جیسے مناجات شعبانیہ میں ہے۔ خدا سے التجا کریں کہ ایسا ہو جائے، لیکن یہ کوئی بات نہیں کہ اس کی وجہ سے ایک جماعت دوسری جماعت کو کافر ٹھہرائے یا ایک گروہ دوسرے گروہ کو جاہل قرار دے۔ اگر کوئی چاہے کہ اسی مفہوم کو ادا کرے تو وہ اسے کیسے ادا کرے گا؟ یہ بھی سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ دوسرے کیا کہتے ہیں۔ اس کے جذبات کو سمجھے جو صرف اسی طرح اپنے دل کا مدعا بیان کرسکتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی کے دل میں نور موجزن ہوتا ہے تو وہ یہ بھی پکار اٹھتا ہے کہ سب کچھ وہی ہے۔ ہمہ اوست![1]

۱۔ یعنی سب کچھ وہ (خدا) ہے۔ یہ عرفاء اور صوفیاء کا قول ہے جن کے نزدیک سوا خدا کے کسی چیز کا وجود نہیں ہے یہ خدا ہی ہے جو مختلف صورتوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مقابل دوسرا مقولہ ہمہ از اوست ہے۔ یعنی سب چیزیں اس (خدا) سے ہیں یعنی کوئی چیز بالذات موجود نہیں ہے بلکہ ہر چیز اپنے وجود کے لیے خدا کی محتاج ہے۔ (رضوانی)

امام علی علیہ السلام اللہ کی آنکھ ہیں ، اللہ کا نور ہیں

آپ دعا میں پڑھتے ہیں کہ علی عین اللہ اس کا کیا مطلب ہے؟

امام علیؑ کے لیے عین اللہ ، نور اللہ ، ید اللہ کے الفاظ مشہور ہیں۔ ید اللہ کے کیا معنی ہیں؟ یہ وہی الفاظ ہیں جو اہل عرفان بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہماری روایات میں بھی یہ آیا ہے کہ جو صدقہ فقیر کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے، وہ خدا کے ہاتھ میں پہنچتا ہے۔

قرآن میں بھی ہے کہ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ وہ بات ہے جو آپ سب کہتے ہیں لیکن اہل عرفان کو دست خدا کی بات کرنے کی اجازت نہیں۔ جب وہ بیچارے صاف صاف نہیں کہہ سکتے تو دوسرے طریقے سے کہتے ہیں۔ اس طرح کی تعبیرات قرآن اور خصوصاً دعاؤں میں بکثرت آئی ہیں۔ جب قرآن اور دعاؤں میں یہ باتیں موجود ہیں تو اہل عرفان سے بدظنی کی وجہ؟ یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ کہنے والے کا مقصد کیا ہے؟ اس نے اس طرح کیوں کہا ہے، اُسے کیا تکلیف ہے کہ اُس نے وہ الفاظ استعمال نہیں کیے جو عام لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اگر اُسے معلوم بھی ہے کہ عوام کس طرح کہتے ہیں تو کیا ہوا؟ اگر اس نے وہ الفاظ استعمال نہیں کیے جو عام پسند ہیں تو اس لیے کہ اس نے حقیقت کو قربان نہیں کیا بلکہ خود کو حقیقت پر قربان کر دیا۔ اگر ہم اس بات کو سمجھ سکیں تو ہم بھی وہی الفاظ استعمال کریں۔

چنانچہ قرآن نے بھی یہ تعبیر اختیار کی ہے اور ائمہ طاہرینؑ نے بھی اسی طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ بالفرض اگر کوئی کہے کہ یہ "حق" ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ خدا ہے۔ ایسی بات کوئی ہوش مند تو کہے گا نہیں۔

یہ دیکھیے کہ ظہور کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے اور اسے حق تعالیٰ سے کیسے جدا کیا جاسکتا ہے چنانچہ ایک دعا میں اولیاء کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

لَا فَرْقَ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُمْ اِلَّا اَنَّهُمْ عِبَادُكَ خَلْقُهُمْ بِيَدِكَ، رَتْقُهُمْ بِيَدِكَ.

"تجھ میں اور ان میں کوئی فرق نہیں بجز اس کے کہ وہ تیرے بندے ہیں۔ ان کو پیدا کرنا اور ان کے امور کی اصلاح کرنا تیرے ہاتھ میں ہے۔"

درحقیقت یہ بھی تعبیر کی نارسائی ہے۔ اسی لیے مطلب ادا کرنے کے لیے ائمہؑ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو دوسروں کے الفاظ کے مقابلے میں قرآن سے نزدیک تر ہیں۔

یہ سمجھیے کہ اہل عرفان وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کوئی بھی کھڑا ہو کر کہہ دے کہ یہ کون ہوتے ہیں؟ ہمارے سامنے ایسے لوگ ہوئے ہیں جن کو ہم نزدیک سے جانتے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ یہ کس قسم کے آدمی ہیں۔ یہ لوگ تمام علوم میں اہل نظر اور باکمال تھے۔ پھر بھی وہ اسی طرح کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ جلوے کا ذکر کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ اللہ کا جلوہ ہے۔ دعائے سمات میں طَلْعَتِكَ[1] کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی بھی جلوہ ہیں۔ اسی طرح کا ایک لفظ نور ہے۔ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِیْ... بِاسْمِكَ اس لیے اہل عرفان سے صلح کر لیجیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان میں سب اچھے ہیں۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ سب کو مسترد مت کیجیے۔ جب میں علماء کی تائید کرتا ہوں تب بھی میرا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ میں ہر قسم اور ہر طرح کے علماء

۱۔ وَبِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِیْ تَجَلَّيْتَ بِهٖ لِلْجَبَلِ فَجَعَلْتَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا وَّبِمَجْدِكَ الَّذِیْ ظَهَرَ عَلٰى طُوْرِ سِيْنَاءَ فَكَلَّمْتَ بِهٖ عَبْدَكَ وَرَسُوْلَكَ مُوْسَى ابْنَ عِمْرَانَ وَبِطَلْعَتِكَ فِیْ سَاعِيْرَ وَظُهُوْرِكَ فِیْ جَبَلِ فَارَانَ.

کی تائید کرتا ہوں۔ میرا مقصد یہی ہوتا ہے کہ سب کو رد مت کیجیے۔ یہ نہیں ہوتا کہ سب کو قبول کر لیجیے۔ یہاں بھی یہی بات ہے۔ یہ مت سمجھئے کہ جو بھی کوئی عارفانہ بات کرتا ہے وہ کافر ہے۔

ہر بات کی تحقیق ضروری ہے

پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ آدمی کہہ کیا رہا ہے۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے تو پھر شاید انکار کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ سارا قصہ وہی عنب، انگور اور اوزم کا ہے ایک اسی بات کو ایک طرح سے بیان کرتا ہے، دوسرا اس کے لیے علیت و معلولیت کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے، تیسرا سببیت و مسببیت کہتا ہے، چوتھا ظہور و مظہر۔ یہ سب کبھی نہ کبھی ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں انھیں سمجھ میں آتا ہے کہ اس ہستی کو کن الفاظ سے تعبیر کیا جائے جو ہر جگہ ہے لیکن وہ اشیاء میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی لیے کہنے والا بھی یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ علیؑ ید اللہ، علیؑ عین اللہ۔

قرآن کہتا ہے: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى.

نیز جس نے آپ سے بیعت کی، اس نے خدا سے بیعت کی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ[1]

یعنی ''اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔'' کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھا ہوا ہو جیسا کہ ہم رکھتے ہیں یا یہاں فوق سے مراد فوق معنوی ہے۔ اسی طرح فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ میں بھی فوق معنوی مراد ہے۔

ہمارے پاس اس فوق کا کما حقہ مطلب ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

۱۔ سورۂ فتح: آیت ۱۰

جس طرح خداوند تبارک و تعالیٰ اس سے بہت بالاتر ہے کہ وہ کسی شے کے ساتھ مخلوط ہو جائے یا عام معنی میں کسی شے سے مربوط ہو، اسی طرح وہ اس سے بھی بالاتر ہے کہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ اس کے جلوے کی کیا نوعیت ہے۔ اس کا جلوہ بھی ہمارے لیے غیر معلوم ہے البتہ یہ ہمارا ایمان ہے کہ اس نوع کی کوئی چیز ہے ضرور۔ ہم اس کے وجود کو مسترد نہیں کرتے۔ جب ہم یہ مانتے ہیں کہ اس طرح کی چیزیں ہیں تو ہمارا یہ یقین ہوتا ہے کہ ان کا ذکر کتاب و سنت میں کسی نہ کسی عنوان سے موجود ہے۔ جلوۂ حق کا ذکر جہاں قرآن میں ہے وہاں تجلی اور ظہور کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ھُوَ الظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ سورۂ حدید میں ہے۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ سورۂ حدید کی آخری چھ آیات ان لوگوں کے لیے ہیں جو آخری زمانے میں آئیں گے۔[1] وہی ان کو سمجھیں گے۔ ان آیات میں تخلیق کی کیفیت وغیرہ کا ذکر ہے۔

اسی سورۂ حدید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ اور وَھُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ اس آخری زمانے کا مطلب بھی کوئی آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔ شاید دنیا میں ایک دو اشخاص ایسے موجود ہوں جو اس کا مطلب سمجھ سکتے ہوں۔

غلط فہمیاں دور ہونی چاہئیں

میرا خاص نکتہ یہ ہے کہ غلط فہمیاں دور ہونی چاہیے۔ جو اختلاف اہل مدرسہ اور اہل علم میں ہے وہ ختم ہونا چاہیے۔ معارف کا راستا نہیں روکنا

۱۔ امام زین العابدین علیہ السلام سے توحید کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: خدا جانتا ہے کہ آخری زمانے میں تحقیقی فکر و نظر رکھنے والے لوگ آئیں گے (جو مسئلہ توحید کے مختلف پہلوؤں کا بڑی دقت سے تجزیہ کریں گے) اسی لیے خدا نے سورۂ توحید اور سورۂ حدید کی آخری آیات کو نازل فرمایا۔ بحار الانوار ج ۳، ص ۲۶۴ (رضوانی)

چاہیے۔ اسلام فقط احکام فرعیہ کا نام نہیں، یہ احکام فرع ہیں، بنیاد کچھ اور ہے۔ ہمیں اصل کو فرع پر قربان نہیں کرنا چاہیے اور یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ اصل بلا ضرورت ہے اور اسے اصل کہنا خلاف واقعہ ہے۔ ایک صاحب کہتے تھے کہ مرحوم شیخ محمد بہاری کے سامنے کسی کا تذکرہ آیا۔ کہنے لگے کہ وہ تو عادل کافر ہے۔ ہم نے کہا: یہ کیا بات ہوئی! عادل بھی ہے اور کافر بھی۔ شیخ محمد بہاری نے کہا: عادل تو اس لیے ہے کہ شرعی احکام پر عمل کرتا ہے۔ کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور کافر اس لیے ہے کہ جس خدا کی وہ پرستش کرتا ہے وہ خدا ہی نہیں۔

چیونٹی بھی اپنی ذات سے محبت کرتی ہے

ہماری روایات میں ہے کہ شاید چیونٹی یہ سمجھتی ہے کہ خدا کے دو سینگ ہیں۔ یہ حب نفس ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ چیونٹی میں بھی ہے۔ یہ چیونٹی بھی عجیب چیز ہے۔ اس کا خیال ہے کہ خدا کے دو سینگ ہیں۔ وہ سینگ ہونے کو کمال سمجھتی ہے۔ ہم بھی جب اپنی خوبی اور کمال کی بات کرتے ہیں تو کچھ اسی طرح سے سوچتے ہیں۔ یہ وہی چیونٹی ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کے لشکریوں کے بارے میں کہتی ہے کہ انھیں سمجھ ہی نہیں۔

یَا اَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰکِنَکُمْ لَا یَحْطِمَنَّکُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ[1] یعنی ”چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اُس کے لشکری تم کو کچل ڈالیں اور اُن کو خبر بھی نہ ہو۔“ فَتَبَسَّمَ ضَاحِکًا مِّنْ قَوْلِهَا[2] حضرت سلیمان علیہ السلام اُس کی

۱۔ سورۂ نمل: آیت ۱۸
۲۔ سورۂ نمل: آیت ۱۹

بات پر ہنستے ہوئے بولے کہ یہ مجھے بے خبر کہتی ہے۔ چیونٹی نے جو بات کہی، سب جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہدہد نے بھی اسی طرح کہا تھا: اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ[1] یعنی ”مجھے ایک ایسی چیز معلوم ہوئی ہے جس کی آپ کو خبر نہیں۔“ یہ بات ایسے آدمی سے کہی جا رہی ہے جو خدا کا پیغمبر ہے اور اُس کے مصاحبین میں ایسا آدمی بھی موجود ہے جو بلقیس کے تخت کو چشم زدن میں یمن سے فلسطین لے آیا تھا۔ اب تک ایسا اتفاق کسی انسان کو پیش نہیں آیا تھا۔ یہ کیا قصہ تھا؟ یہ بات خود غیر معلوم ہے۔ کیا یہ کوئی بجلی کا مواصلاتی نظام تھا یا کسی چیز کو معدوم کر کے دوبارہ وجود میں لانے کی صورت تھی؟ کیا اس تخت کو بجلی کی لہروں میں تبدیل کر کے پہنچایا گیا تھا؟ آخر کیا بات تھی؟

روایت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے ایک شخص (آصف بن برخیا) اسم اعظم کا ایک حرف جانتا تھا۔ وہ ایسا تھا کہ پلک جھپکنے سے بھی پہلے مطلوب کو حاضر کر دیتا تھا۔ ایسے پیغمبر کے سامنے ہدہد کہے کہ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ بہرحال مرحوم شیخ محمد بہاری کے کہنے کی بنیاد یہ تھی کہ وہ جو کچھ سمجھتے تھے وہی کہتے تھے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔

بعض مسائل سے محروم رہنا بدقسمتی ہے

میرا خیال یہ ہے کہ اہل علم کے ایک گروہ کی جس میں بہت اچھے اور نیک لوگ شامل ہیں بعض مسائل سے محرومی بدقسمتی ہے۔ ہم قم میں آئے تو مرزا علی اکبر حکیم رحمۃ اللہ علیہ قم میں تھے۔ جب قم میں حوزۂ علمیہ قائم ہوا تو ایک مقدس شخصیت نے جو اب ہم میں نہیں رہی کہا تھا دیکھو اب اسلام کی کیا

۱۔ سورۂ نمل: آیت ۲۲

نوبت آگئی ہے کہ مرزا علی اکبر کے گھر میں اسلام کا کاروبار شروع ہوا ہے!

علماء وہاں جاکر درس لیتے تھے۔ مرحوم آغا خوانساری اور مرحوم آغا اشراقی جیسے بزرگ مرزا علی اکبر سے پڑھتے تھے اور ان صاحب نے فرمایا تھا کہ دیکھو یہ نوبت آگئی ہے کہ اسلام کا کاروبار مرزا علی اکبر کے گھر میں شروع ہوا ہے حالانکہ یہ صاحب نیک آدمی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے ایک نمائندے نے منبر پر کہا تھا کہ میں نے خود مرزا علی اکبر کو قرآن پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ آغا شاہ آبادی مرحوم کو اس سے بہت تکلیف پہنچی تھی کہ اُن صاحب نے یہ کہا کہ مرزا علی اکبر بھی قرآن پڑھتے تھے۔

بہرصورت اس طرح کی بدگمانیاں اور اپنے آپ کو ایک نیک کام سے علیحدہ رکھنا افسوسناک ہے۔ یہ صاحب ایک علمی مرکز میں شرکت سے بھی جو بہت نیکی کا کام ہے محروم رہے۔ اور باتوں کو چھوڑیے فلسفہ تو بہت معمولی چیز ہے کچھ لوگوں کو اس پر بھی اعتراض ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کا مطلب نہیں سمجھتے اسی وجہ سے یہ سب جھگڑے پیش آتے رہتے ہیں۔ اگر مطلب سمجھ لیں تو کوئی جھگڑا نہ رہے۔ ایک صاحب باہمہ ریش و عمامہ دوسرے صاحب کی تکفیر کرتے ہیں اس لیے کہ انھیں معلوم نہیں کہ دوسرے صاحب کہتے کیا ہیں۔ دوسرے صاحب کی خطا یہ ہے کہ وہ علیت و معلولیت جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو پہلے صاحب کی نظر میں ایسی تعبیریں ہیں جو خلاف واقعہ ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اسم، مسمّٰی سے جدا نہیں ہے۔ اسم، ظہور ہے، علامت ہے۔ لیکن ایسی علامت نہیں جیسے کہ عام طور پر سنگ میل نصیب کر دیئے جاتے ہیں، اسی لیے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ فلاں چیز اللہ کی علامت ہے۔ قرآنی آیات میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ

حقیقت سے نزدیک تر ہیں۔ پھر بھی وہ حقیقت کی کماحقہ، نمائندگی نہیں کرتے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ ان سے بہتر الفاظ موجود نہیں۔

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن ایک دسترخوان کی مانند ہے۔ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق اس سے مستفید ہوسکتا ہے۔ اس پر کسی ایک گروہ کی اجارہ داری نہیں۔ وہ سب کا ہے اور سب کو اس سے مستفید ہونے کا حق ہے۔ ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی دعائیں معارف سے مالا مال ہیں لیکن کچھ افراد کی کوشش ہے کہ لوگوں کو ان سے محروم کر دیں۔ دعاؤں میں معارف ہیں۔ دعائیں قرآن کی زبان ہیں۔ دعائیں شارح قرآن ہیں۔ وہ ان مسائل کی تشریح کرتی ہیں جن تک دوسروں کی رسائی نہیں۔

لوگوں سے دعائیں چھڑانا بالکل غلط ہے

لوگوں سے دعائیں چھڑانا غلط ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ اب ہم قرآن پڑھنا چاہتے ہیں، اس لیے دعا کچھ نہیں۔ لوگوں کو دعا سے انسیت پیدا کرنی چاہیے تاکہ خدا سے انسیت پیدا ہو۔ جن لوگوں کو خدا سے انسیت ہے، ان کے نزدیک دنیا کی کچھ حقیقت نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو اہمیت نہیں دیتے۔ خدا کے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ انہی میں وہ لوگ ہیں جو خدا کے لیے جہاد کرتے تھے اور دعائیں بھی پڑھتے تھے۔ ان کے بھی یہی حالات تھے لیکن وہ خدا کے لیے تلوار چلاتے تھے۔ لوگوں کو ان برکات سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن اور دعا اسی طرح ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں، جس طرح رسولؐ، قرآن سے جدا نہیں ہیں۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے پاس قرآن ہے اس لیے ہمیں رسولؐ کی ضرورت نہیں۔ قرآن اور رسولؐ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ وہ ہمیشہ

اکٹھے ہی رہیں گے۔ اُن میں جدائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اہلبیت رسولؐ بھی قرآن سے جدا نہیں ہیں جیسا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے: لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ یعنی ”قرآن اور اہلبیتؑ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں گے۔“

ہم اگر الگ الگ حساب لگائیں اور یہ چاہیں کہ قرآن علیحدہ ہو، ائمہ طاہرینؑ علیحدہ ہوں اور دعائیں علیحدہ ہوں اور دعاؤں کے متعلق بھی یہ کہیں کہ ہمیں دعاؤں سے مطلب نہیں اور دعا کی کتابوں کو آگ لگا دیں یا فرض کریں کہ عارفوں کی کتابوں کو جلا دیں، تو جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیچارے ناواقف ہیں۔ جب آدمی اپنی حد سے گزر جاتا ہے تو غلطی میں پڑ جاتا ہے۔

کسروی اور حافظ

کسروی ایک تاریخ نویس تھا۔ اس کی تاریخی معلومات اچھی تھیں۔ لکھتا بھی خوب تھا لیکن اس میں غرور پیدا ہوگیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پیغمبری کا دعویٰ کرنے لگا۔ دعاؤں کو بالکل چھوڑ دیا۔ قرآن کو ضرور مانتا تھا۔ نبوت کو اتنا گرایا کہ اپنی سطح پر لے آیا۔ خود تو اوپر اٹھ نہیں سکتا تھا، نبوت کو گرا دیا۔ دعاؤں اور قرآن وغیرہ کا سب کا ساتھ ہے۔ عرفاء، عارف مسلک شعراء اور فلاسفہ سب ایک ہی بات کہتے ہیں۔ ان کے مطالب الگ الگ نہیں صرف تعبیر کا فرق ہے اور زبان مختلف ہے۔ شعر کی اپنی ایک خاص زبان ہے۔ حافظ کا خود اپنا ایک الگ اسلوب اور طرز بیان ہے۔ حافظ بھی وہی مسائل بیان کرتا ہے جو دوسرے کرتے ہیں لیکن ایک دوسری زبان میں۔ زبانیں مختلف

ہوں لیکن مضمون کی برکتوں سے لوگوں کو محروم نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن وسنت اور دعاؤں کے وسیع دسترخوان کی طرف لوگوں کو بلایا جائے تاکہ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق اس سے فیض اٹھا سکے۔

یہ تمہید تھی ان سب مضامین کی جو بعد میں پیش کئے جائیں گے۔ اگر زندگی رہی اور ہم نے بھی کسی وقت کوئی ایسی تعبیر بطور احتمال بیان کر دی تو یہ نہ کہیے کہ ہم بھی ان تعبیرات کو دوبارہ میدان میں لے آئے۔ نہیں یہ بات نہیں۔ ان تعبیرات کو تو دوبارہ رواج پانا چاہیے۔ کچھ کاریگر قسم کے لوگ آغا شاہ آبادی مرحوم کے پاس آیا کرتے تھے۔ مرحوم ان کے سامنے بھی مسائل اس طرح بیان کرتے تھے جیسے اور سب کے سامنے۔ میں نے ایک دن ان سے عرض کیا کہ یہ لوگ اور یہ مسائل؟ کہنے لگے: چھوڑو۔ یہ کفریات ان کے کانوں میں بھی پڑ جائیں تو اچھا ہے! ہمارے یہاں بھی کچھ ایسے لوگ تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کون تھے۔ کسی کا نام لینا غلطی ہوگی۔

اب موضوع بحث یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں بھی اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے بعد بھی اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے بِسْمِ اللّٰہِ میں اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے الفاظ اسم کی بھی صفت ہو سکتے ہیں اور اللہ کی بھی۔ دونوں احتمالات ہیں۔ اگر زندگی رہی تو انشاء اللہ ہم دیکھیں گے کہ ان دونوں میں سے کون سا احتمال فہم سے نزدیک تر ہے۔

اس درس کے بعد امام خمینیؒ کو بوجوہ درس تفسیر کا یہ سلسلہ منقطع کرنا پڑ گیا چنانچہ مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ کے بمصداق ہم نے ان پانچ تقریروں کو شائع کیا ہے تاکہ یہ کتابی صورت میں محفوظ ہو جائیں۔

فہرست آیات قرآنی

— بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

— اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

— اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

— اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ

— وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ

— اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ

— قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ

— یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ

— یُسَبِّحُ لَہٗ مَافِی السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ

— وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی

— اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ

— وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِہٖ مُھَاجِرًا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ثُمَّ یُدْرِکْہُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ

— اِنَّ جَھَنَّمَ لَمُحِیْطَۃٌ بِالْکَافِرِیْنَ

— مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ

— رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ لَنْ تَرَانِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوْفَ تَرَانِیْ فَلَمَّا فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا

— اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا

— اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ

— رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ

— نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ

— اِنَّا اَنْزَلْنَاہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ

— اِنِّیْ آنَسْتُ نَارًا لَعَلِّیْ آتِیْکُمْ مِّنْھَا بِقَبَسٍ... یَا مُوْسٰی اِنِّیْ اَنَا رَبُّکَ.... اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ

— قُلْ اِنَّمَا اَعِظُکُمْ بِوَاحِدَۃٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ

— قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْ لَا دُعَآءُکُمْ

— اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ

— ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ

— ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّھَادَۃِ ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ.

— اُدْعُوا اللّٰہَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّا مَا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی

— لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ

— ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ

— یَا اَیُّھَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسَاکِنَکُمْ لَا یَحْطِمَنَّکُمْ سُلَیْمَانُ وَجُنُوْدُہٗ وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ... فَتَبَسَّمَ ضَاحِکًا مِّنْ قَوْلِھَا... اَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِہٖ

اشاریہ

شخصیات

محمد، مصطفیٰ، خاتم النبیین، نبی کریم
رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ۱۲
۱۴، ۱۷، ۳۱، ۴۱، ۴۳، ۴۷، ۵۸
۶۲، ۶۴، ۶۵، ۷۳، ۷۴، ۷۶، ۹۱
۹۳، ۱۲۲
ابوذر رضی اللہ عنہ (حضرت) ۱۲
ابوسفیان ۴۸، ۷۳
ارسطو ۱۰۵
آصف بن برخیا ۱۱۹
آغا اشراقی ۱۲۰
آغا خوانساری ۱۲۰
آغا شاہ آبادی ۱۲۰، ۱۲۳
بلقیس (ملکۂ سبا) ۱۱۹
بوعلی سینا (شیخ الرئیس) ۸۹، ۹۶
جبریل امینؑ، روح الامینؑ (حضرت)
۶۲، ۹۴
حافظ شیرازی ۱۲۲
حسن علیہ السلام (امام) ۱۲
حسین علیہ السلام (امام) ۱۲، ۶۹، ۷۵
سلمان رضی اللہ عنہ (حضرت) ۱۲
سلیمان علیہ السلام (حضرت) ۱۱۸، ۱۱۹
سید قطب ۱۴
شعیب علیہ السلام (حضرت) ۹۰
شیخ طبرسی ۱۴
شیخ محمد بہاری ۱۱۸، ۱۱۹
طنطاوی جوہری ۱۴
عبدالرزاق کاشانی ۱۳
علی علیہ السلام (امیرالمومنین امام) ۱۲،
۴۸، ۴۹، ۵۲، ۷۶، ۷۷، ۸۲، ۱۱۴
علی اکبر حکیم (مرزا) ۱۱۹، ۱۲۰
عمرو بن عبدوَد ۴۸
غالب (مرزا) ۷۶
فاطمہ سلام اللہ علیہا (جناب) ۱۲
فرعون ۱۰۹
کسروی ۷۷، ۱۲۲
کمیل بن زیاد نخعی (جناب) ۷۷
محی الدین ابن عربی ۱۳
معاویہ ۴۸، ۷۷
ملا سلطان علی ۱۳
موسیٰ علیہ السلام (حضرت) ۵۹، ۶۰،
۶۱، ۶۳، ۹۰، ۹۱، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۲

کتب

قرآن مجید
مجمع البیان ۱۴
مفاتیح الجنان ۷۶، ۱۱۰
نہج البلاغہ ۷۶

اماکن

ایران ۹، ۱۰، ۱۱
شام ۷۷
عراق ۷۷
عرب ۵۲
فلسطین ۱۱۹
یمن ۱۱۹

حیوان

اونٹ ۵۸، ۵۹
چیونٹی ۱۱۸، ۱۱۹
ہدہد ۱۱۹
کتا (کتے) ۲۹
توتا (توتے) ۵۴، ۷۷

اشیاء

آگ (آتش) ۵۰، ۷۱،
۷۷، ۹۰، ۹۱، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۲۲
آئینہ (آئینے) ۹۴، ۹۵
انگور ۱۰۲، ۱۱۶
برف ۱۸
بیلچہ ۷۴
پانی ۱۸، ۲۲
پتلون ۱۰۳
پتھر ۴۳، ۹۹
پہاڑ ۵۹، ۶۰، ۶۱
تخت ۱۱۹
تلوار ۲۸، ۷۵، ۷۷، ۱۲۱
تیر ۲۷
چاند ۲۶، ۵۳
چراغ ۱۹، ۶۶
درخت ۲۲، ۶۳، ۹۱
دریا ۶۹، ۸۶
دسترخوان ۱۰۰، ۱۲۱، ۱۲۳
دیوار ۸۹، ۹۸

سورج ۲۶، ۳۶، ۵۳، ۵۴
۵۶، ۵۹، ۶۴، ۶۵، ۹۴، ۹۵، ۱۰۵

عصا ۱۰۳

عمامہ ۱۰۳، ۱۰۷ ۱۲۰

قالین ۴۵

قطرہ ۶۹

کتاب ۱۴، ۳۰، ۷۱، ۷۲

کرسی ۴۵، ۷۲

کنکری ۲۱

کنوئیں ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۷

کوٹ ۱۰۳

گیس ۱۸

گھاس ۱۰۰

گھر ۲۲، ۴۲، ۷۲، ۹۰، ۱۲۰

لاٹھی ۸۹، ۹۱

محراب ۷۲

منبر ۷۲، ۱۲۰

موٹر ۱۹

موج ۸۶

نشتر ۹۸

ہوا ۱۸